شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) اور تنہائی (Solitude) کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار

شگفتہ پروین

فیکلٹی آف لینگوئجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست، 2021ء

شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) اور تنہائی (Solitude) کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار

شگفتہ پروین

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست، 2021ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) اور تنہائی (Solitude) کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: شگفتہ پروین **رجسٹریشن نمبر:** F18-U-MP-1583

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر ظفر احمد: ----------

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی: ----------

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان: ----------

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ: ----------

اقرارنامہ

میں، شگفتہ پروین حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے ایم۔فل اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ظفر احمد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

شگفتہ پروین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست، 2021ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرستِ ابواب	iv
Abstract	vii
اظہارِ تشکر	viii
باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیانِ مسئلہ	۲
iii. مقاصدِ تحقیق	۲
iv. تحقیقی سوالات	۲
v. نظری دائرہ کار	۳
vi. تحقیقی طریقہ کار	۳
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
viii. تحدید	۴
ix. پس منظری مطالعہ	۴
x. تحقیق کی اہمیت	۴

ب۔ جبر اور تنہائی کے بنیادی مباحث ۵

i. فلسفۂ وجودیت میں جبر اور تنہائی ۵

ii. جبر کے ادبی، سماجی اور نفسیاتی مباحث ۱۱

iii. تنہائی کے ادبی، سماجی اور نفسیاتی مباحث ۱۷

ج۔ ڈاکٹر شفیق انجم کی سوانح و شخصیت ۲۲

i. مختصر کوائف اور شخصیت ۲۲

ii. ادبی احوال و آثار ۲۶

iii. زیر تحقیق افسانوی مجموعوں کا مختصر تعارف ۲۹

الف۔ افسانوی مجموعہ "میں + میں" کا تعارف ۲۹

ب۔ افسانوی مجموعہ "لکھت لکھتی رہی" کا تعارف ۳۱

ج۔ افسانوی مجموعہ "روشنی آواز دیتی ہے" کا مختصر تعارف ۳۲

حوالہ جات ۳۴

باب دوم: شفیق انجم کے افسانوں میں "جبر" کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ ۳۶

الف۔ شفیق انجم کے افسانوں میں جبر کے تقدیری تناظرات ۳۸

ب۔ شفیق انجم کے افسانوں میں جبر کے نفسیاتی تناظرات ۴۵

ج۔ شفیق انجم کے افسانوں میں جبر کے سماجی تناظرات ۵۳

حوالہ جات ۶۷

باب سوم: شفیق انجم کے افسانوں میں "تنہائی" کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ ۷۰

الف۔ شفیق انجم کے افسانوں میں تنہائی کے سماجی تناظرات ۷۱

ب۔ شفیق انجم کے افسانوں میں تنہائی کے نفسیاتی تناظرات ۷۸

ج۔ شفیق انجم کے افسانوں میں تنہائی کے ادبی / شناختی تناظرات ۸۵

حوالہ جات ۱۰۱

باب چہارم: ماحصل، نتائج، سفارشات ۱۰۲

الف۔ مجموعی جائزہ ۱۰۴

ب۔ تحقیقی نتائج ۱۱۴

ج۔ سفارشات ۱۱۵

کتابیات ۱۱۵

ضمیمہ ۱۱۸

الف۔ انٹرویو ۱۱۸

Abstract

Dr. Shafique Anjum has been described by leading literary critics as a representative modern novelist and his fiction has been described as a spokesman for the solitude and determinism of the individual in contemporary life. Literary personalities like Shams-ur-Rehman Farooqi, Dr. Rashid Amjad and Prof. Ahmad Javed called him (Shafiq Anjum) a fiction writer who illustrates the problems and pains of modern life. Critics have repeatedly pointed out the elements of determinism and solitude in Shafique Anjum's fiction. In this thesis, Shafique Anjum's fiction has been examined in the same context.

Existencialism is a philosophy of life according to which man is independent in his individuality and narrative. In simple words, what is man according to this theory? The philosophy of loses its status because the statement of this theory is that man is the first reality. The existence of which is unambiguous and does not require any preconceived notions to prove its existence, so existential thinkers place the "individual" above the collective life. Every individual is free and responsible for his own actions. With this responsibility of choice, every individual becomes a victim of mental anxiety and mountains of troubles fall on him. His actions are within the realm of time and space. As a result of their actions, they face destruction, death, determinism, and solitude. We can see the reflection of existential elements in Shafique Anjum's fictions. An elemental study of the elements of determinism and solitude in fiction.

Dr. Shafique Anjum has done his best to write about contemporary life and its problems. In his fictions, the echoes of the pains and related tragedies of modern life are prominent. In particular, he has made the solitude and determinism of the individual the subject in contemporary life He has also documented various forms of determinism and human helplessness. It was necessary to bring out a research work focusing on these aspects so that the contemporary meaning of Shafique Anjum could be better understood.

اظہارِ تشکر

اللہ رب العزت کی بے حد شکر گزار ہوں جس کے فضل و کرم سے یہ مرحلہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ بے شک اللہ کی مہربانی کے بغیر یہ صبر آزما سفر طے کرنا مشکل تھا۔ اس کے بعد میں اپنی والدہ کی شکر گزار ہوں جن کی محبت ، شفقت اور دعاؤں کا سایہ ہمیشہ مجھ پر رہا۔ میں اپنے نگرانِ مقالہ جناب ڈاکٹر ظفر احمد کی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی نگرانی میں کام کرنے کا موقع دیا اور دورانِ تحقیق ہر طرح کی معاونت اور رہنمائی فرمائی۔ میں دیگر اساتذہ کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے کورس ورک سے لے کر مقالہ کی تکمیل تک تعاون کیا۔ ان واجب الاحترام اساتذہ میں نمل یونیورسٹی اسلام آباد کی صدرِ شعبہ اردو ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ، ڈاکٹر عابد سیال صاحب، ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ، ڈاکٹر شفیق انجم صاحب،، ڈاکٹر نعیم مظہر صاحب، ڈاکٹر محمود الحسن صاحب، ڈاکٹر صائمہ نذیر صاحبہ، ڈاکٹر رخشندہ مراد صاحبہ، ڈاکٹر نازیہ یونس صاحبہ ، ڈاکٹر ارشاد بیگم صاحبہ اور دیگر اساتذہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر شفیق انجم کا خصوصی شکریہ ادا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ انہوں نے دورانِ تحقیق کمال مہربانی و شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری رہنمائی فرمائی اور سوالوں کے جوابات عنایت کیے۔ ان تمام اساتذہ کرام کی علمی بصیرت کی بدولت میرے علم و دانش میں اضافہ ہوا۔ جنہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک ہر قدم پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ میں اپنے ان احباب کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے مواد کی فراہمی اور دیگر تحقیقی امور میں مدد فرمائی۔ میں ارشد محمود ہادیؔ، اپنی سہیلیوں، ہم جماعتوں اور دیگر کرم فرماؤں کی بھی بے حد شکر گزار ہوں جو موضوع کے انتخاب سے لے کر تحقیقی مقالے کی تکمیل تک معاون رہے۔ میں اپنے تمام گھر والوں کی بھی شکر گزار ہوں جو میرے لئے آسانیاں پیدا کرنے میں پیش پیش رہے۔ آخر میں ایک بار پھر میں اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر ظفر احمد کی سپاس گزار ہوں جنہوں نے ہمہ وقت رہنمائی فرمائی حتیٰ کہ کورونائی حالات میں بھی انہوں نے ہر طرح سے معاونت فرمائی، موضوعِ تحقیق کے انتخاب سے لے کر تکمیلِ مقالہ تک ہمیشہ اُن کا ساتھ رہا اور ان کے تنقیدی و تحقیقی شعور نے اس کٹھن کام کی تکمیل کو ممکن بنایا۔ شکریہ

شگفتہ پروین

ایم فل اردو اسکالر

باب اول

موضوعِ تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف

شفیق انجم جدید افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ وہ محقق، نثر نگار اور ناول نگار بھی ہیں۔ اور نمل میں بطور استاد اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ کالج کے زمانے سے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ڈاکٹر رشید امجد اور پروفیسر احمد جاوید جیسے شفیق اساتذہ کی سرپرستی میں بطور افسانہ نگار آپ کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں اور ۲۰۰۷ء میں آپ نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا۔ آپ کا پہلا افسانہ ادبی رسالے "سیپ" کراچی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تخلیقات کا سلسلہ چل پڑا۔ ناول، تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ان کی متعدد کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے "میں + میں "" لکھت لکھتی رہی" اور "روشنی آواز دیتی ہے" شائع ہو چکے ہیں۔ اور اردو دنیا کے قارئین اور نامور ناقدین سے داد وصول کر چکے ہیں۔

وجودیت ایک ایسا فلسفہ حیات ہے جس کے مطابق انسان اپنی انفرادیت اور داستان کے سلسلے میں خود مختار ہے آسان الفاظ میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس نظریے کے مطابق انسان کیا ہے؟ کا فلسفہ اپنی حیثیت کھو دیتا ہے کیونکہ اس نظریے کا بیان یہ ہے کہ انسان سب سے پہلی حقیقت ہے۔ جس کا وجود غیر مبہم ہے اور اس کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے کسی پیش رو نظریے کی ضرورت نہیں چنانچہ وجودی مفکرین اجتماعی زندگی کے مقابلے میں 'فرد" کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں ان کے فکر و فلسفے میں محض انسان کا انفرادی وجود اہمیت رکھتا ہے۔ ہر فرد آزاد ہے اور اپنے عمل کا خود ذمے دار ہے۔ انتخاب کی اس ذمہ داری سے ہر فرد ذہنی اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے اور اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس کا عمل زمان و مکاں کے دائرے میں محدود و مقید ہو جاتا ہے۔ اپنے عمل کے نتیجے میں تباہی، موت، جبر اور تنہائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وجودی عناصر کی جھلک شفیق انجم کے افسانوں میں ہمیں جا بجا نظر آتی ہے۔ مجوزہ تحقیق میں شفیق انجم کے تینوں افسانوی مجموعوں کے افسانوں میں جبر اور تنہائی کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ

شفیق انجم نے معاصر زندگی اور اس کے مسائل پر لکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے اُن کے افسانوں میں جدید زندگی کے آلام اور متعلقہ المیوں کی بازگشت نمایاں ہے۔ بہ طور خاص انہوں نے معاصر زندگی میں فرد کی تنہائی اور جبر کو موضوع بنایا ہے ساتھ ساتھ انہوں نے جبر کی مختلف صورتوں اور انسانی بے بسی کو بھی قلمبند کیا ہے۔ ضروری تھا کہ ان جہات کو فوکس کرتے ہوئے ایک تحقیقی کام سامنے لایا جائے تاکہ شفیق انجم کی معاصر معنویت بہتر طور پر سمجھی جاسکے۔

iii۔ مقاصد تحقیق

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل تھے۔

(الف) شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) اور تنہائی (Solitude) کے عناصر کا تعین کرنا۔

(ب) فلسفہ وجودیت کے تناظر میں شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) اور تنہائی (Solitude) کے عناصر کا تجزیہ کرنا

(ج) شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) اور تنہائی (Solitude) کے عناصر کے ادبی، سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں کا تجزیہ کرنا۔

iv۔ تحقیقی سوالات

(الف) شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) اور تنہائی (Solitude) کے عناصر کی نوعیت اور محرکات کیا ہیں؟

(ب) شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) اور تنہائی (Solitude) کے عناصر کے وجودی پہلو کیا ہیں؟

(ج) شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) اور تنہائی (Solitude) کے عناصر کی ادبی و سماجی معنویت کیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار

وجودیت کا باقاعدہ آغاز انقلاب فرانس کے بعد ہوا۔ اور وجودیت کی وسیع وترویج دوسری جنگ عظیم کے دوران ہوئی۔ ان جنگوں کے زیر اثر پیدا ہونے والے معاشی ،سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی مسائل نے وجودیت کے پودے کی آبیاری کی۔ جنگ کے ہیبت ناک اثرات نے لوگوں کے ذہنوں پر خوف، دہشت، مایوسی، ناامیدی کے ہولناک اثرات مرتب کیے۔ اس کے علاوہ سائنس ، صنعتی اور مشینی زندگی کا بھی وجودیت کے احساس کو عام کرنے میں بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ جنگ کے تباہ کن اثرات نے انسانوں کے ذہنوں پر ہولناک اثرات چھوڑے اور انسان کے پاس صرف اس کا وجود رہ گیا جس سے ایک نئے انسان نے جنم لیا اور یہ احساس عام ہوا کہ انسان خود میں معنی خیز اور قیمتی ہے۔ اس کے پاس خود کی داخلی بصیرت وقوت ہے جن کی مدد سے وہ اپنی راہیں متعین کر سکتا ہے۔ لیکن در حقیقت انسان کو ایسی زندگی کا سامنا تھا۔ جس پر مایوسی، نا امیدی، جبر، تنہائی، دہشت اور خوف کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس تلخ حقیقت نے وجودیت کے احساس کو عام کیا۔ چنانچہ فرد کو تنہائی، جبر، خوف اور دہشت کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔

شفیق انجم کو ادب کے معروف ناقدین نے ایک نمائندہ جدید افسانہ نگار قرار دیا ہے اور ان کے افسانوں کو معاصر زندگی میں فرد کی تنہائی اور جبر کی صورتحال کا ترجمان قرار دیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر رشید امجد اور پروفیسر احمد جاوید جیسی ادبی شخصیات نے انہیں (شفیق انجم) عصری زندگی کے مسائل اور آلام کے نقوش واضح کرنے والا افسانہ نگار قرار دیا۔ ناقدین نے شفیق انجم کے افسانوں میں جبر اور تنہائی کے عناصر کی بھی بہ تکرار نشاندہی کی ہے۔ زیر نظر مقالے میں شفیق انجم کے افسانوں کا اسی تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل اختر محبی کی کتاب "فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ" اور "ڈاکٹر حیات عامر حسینی" کی کتاب "وجودیت" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار

تحقیق کا موضوع "شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (determinism) اور تنہائی (solitude) کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ" ہے۔ لہذا اس موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب اور مطالعہ و تجزیہ کرنا ہو گا۔ بنیادی ماخذات میں شفیق انجم کے افسانوی مجموعے جبکہ ثانوی ماخذات میں موضوع سے متعلق دیگر

کتب و مقالات کا مطالعہ کیا گیا۔ جن تک رسائی کے لئے لائبریری سے رجوع کرنے کے علاوہ انٹرنیٹ اور دیگر ماخذات سے حسبِ ضرورت استفادہ کیا گیا ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

مجوزہ موضوع پر قبل ازیں کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تاہم شفیق انجم کے افسانوں کے حوالے سے ایم۔اے اور بی،ایس سطح کے مقالے لکھے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

Hassnat Ahmed, Elements of poverty, hope, love and sacrifices in the short stories of O Henry and Shafique Anjum Department of English, NUML, 2015

حلیم احمد، شفیق انجم کی افسانہ نگاری، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

viii۔ تحدید

یہ تحقیق شفیق انجم کے تین افسانوی مجموعوں "میں + میں"، "لکھت لکھتہ رہی" اور "روشنی آواز دیتی ہے" کے افسانوں حوالے سے ہے جن میں جبر اور تنہائی کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کرنا ہے۔ اس میں ان کی دیگر تحقیقی و تنقیدی کتب کو شامل تحقیق نہیں کیا گیا۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر معاصر افسانوں پر لکھی گئیں تنقیدی کتب کا جائزہ لیا گیا۔ اسکے علاوہ شفیق انجم کے افسانوں پر لکھے گئے مضامین جامعاتی مقالات، مختلف ادبی شخصیات کے تبصروں، آرا اور تجزیوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

شفیق انجم کا مختلف ادبی حوالوں سے متنوع کام منظر عام پر آچکا ہے جس میں نظمیہ کہانیاں، تدوینی سلسلے اور تحقیقی و تنقیدی آثار نمایاں ہیں۔ تاہم ان کے فسانے بہ طور خاص توجہ طلب ہیں اور یہ ان کی ایسی تحقیق جہت ہے جسکی معنویت کو سمجھنے اور بیان کرنے کے ساتھ ضرورت ہے۔ ان افسانوں میں انہوں نے

موضوعات کے حوالے سے بھی اچھوتے پن کا ثبوت دیا ہے۔ اس تحقیق کے ذریعے شفیق انجم کی ان جہات کو کھوجنے اور اس کے پس منظر و پیش منظر کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ب۔ جبر اور تنہائی کے بنیادی مباحث

عہدِ قدیم سے دورِ جدید تک اگر مرحلہ وار مختلف فکری تحریکوں کا جائزہ لیا جائے تو ان تمام میں وجود کی اہمیت روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے۔ انسانی وجود کی پُر اسراریت کو سمجھنے اور جانچنے کی کوشش میں سائنس نے اسے اعصابی جال کا نظام قرار دیا۔ لیکن یہ وجود کی حقیقت تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ نفسیات نے کسی حد تک انسانی وجود کی حقیقت جاننے کی طرف پیش قدمی کی لیکن خاطر خواہ نتائج حاصل نہ کر سکی۔ مغرب کے جدید فلسفیانہ تصورات میں فلسفۂ وجودیت نے انسانی وجود کی حقیقت اور پُر اسراریت کو جاننے کی کوشش ایک الگ نقطۂ نظر سے کی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ وجودیت در حقیقت فرد کی انفرادی زندگی سے متعلق ہے جو فرد کے شعور، اس کے احساسات و جذبات، اس کی داخلی کیفیات اور آگہی پر بھرپور بات کرتی ہے۔ ان احساسات و جذبات میں جبر اور تنہائی وجودیت کی اہم اصطلاحات ہیں۔

i۔ فلسفۂ وجودیت میں جبر (Determinism) اور تنہائی (Solitude)

روایتی سطح پر وجودی فلسفہ ڈیکارٹ، کانٹ، ہیگل، مارکس اور ہسرل کے پیش کردہ مسائل کی پیش رفت اور مغربی تعقلاتی مسائل و فکر کا ردِ عمل سمجھا جاتا ہے۔ ان دو زاویۂ نظر کے علاوہ ایک تیسرا اور موضوعِ تحقیق سے متعلقہ نقطۂ نظر بھی وجودی فلسفے کا اہم اور بنیادی حصہ ہے۔ وہ ہے اثباتِ ذات، یعنی فرد کی موضوعیت، داخلیت۔ فرد کا اثباتِ ذات وجودی فلسفے کا اہم موضوع ہے۔ وجودیت کی اصطلاح اور خاص طور پر اس متذکرہ اہم موضوع پر وسیع پیمانے کے مباحث گابریل مارسل اور ژاں پال سارتر کے ملتے ہیں۔[1]

مشہور مؤرخِ فلسفہ ایف سی کوپل سٹون (F.C. Copleston) کہتا ہے کہ "اگر مختلف وجودی فلسفوں کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ تمام فلسفوں کا مرکزی نقطہ یا بنیادی موضوعِ بحث 'انسان' ہے"[2]۔ وجودیت میں جبر اور تنہائی کے عناصر کا احاطہ کرنے سے پہلے وجودیت کو سمجھنا ضروری ہے۔

وجودیت کو انگریزی میں Existentialism کہتے ہیں۔ لفظ Existence کا اردو ترجمہ وجود کیا جاتا ہے۔ یہ لاطینی الفاظ Ex اور Sistere کا مجموعہ ہے۔ لفظ Ex کا معنی ہے Out اور لفظ Sistere جو Stare سے مشتق ہے، جس کے معنی To Stand ہیں۔[۳] Out Stand کے معنی ہیں "نمایاں، جسے کرنا ابھی باقی ہو"[۴] ان دونوں الفاظ کا مجموعی اور بنیادی معنی To Stand Out یا Emerge ہے۔[۵] انگریزی لفظ Emerge کے معنی ہیں "نکلنا، بر آمد ہونا، ظاہر ہونا"[۶]

لفظ Existence کے لغوی مباحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا تعلق وجود سے ہے۔ یعنی کسی شے کا ہونا یا وجود ہونے سے متعلق ہے۔ لفظ وجود کا لغوی معنی، ہونا، موجود ہونا، ظاہر ہونا، ہستی یا زندگی ہے۔ اس لفظ کا مادہ ہے، وَجَد ہے جس کے معنی پانا، ہونا ہے[۷]۔ جبکہ سید احمد دہلوی کے نزدیک وجود کے معنی "ہستی، ذات، نقیضِ عدم، موجودگی، بود، مجازاً جسم، بدن۔"[۸]

لغوی اعتبار سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انگریزی اور اردو میں وجودیت کا قضیہ فرد، ذات، زندگی، وجود، اور انسان سے جڑا ہے۔ "ہائیڈیگر بھی وجودِ انسانی اور اس کے بارے میں فہم و ادراک کو موضوعِ بحث بناتا ہے۔[۹]۔ جیسپر بھی حق و صداقت اور اقدار تک پہنچنے کی انسانی کاوشوں کو ماورائی وجود تک رسائی پانے کی بلند تر کاوش کا حصہ سمجھتا ہے۔[۱۰] اور سارتر کے لیے تو وجودیت ہے ہی انسانیت کا دوسرا نام[۱۱]

لغوی مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وجودیت انسانی وجود اس کی ذات، ہستی اور زندگی کے اثبات پر زور دیتی نظر آتی ہے۔ انسان نے جب سے ہوش سنبھالا اسے دو طرح کے سوالات سے واسطہ پڑا۔ ایک یہ کہ وہ کون ہے؟ دوسرا یہ کہ وہ کیا بن سکتا ہے؟ مختلف حالات و واقعات میں انسانی فکر بھی کئی تشبیب فراز کا شکار رہی ہے۔ انسان اپنی بقا کی جنگ اپنی پیدائش سے ہی لڑتا آیا ہے۔ اور ان سوالات کے جوابات کی تلاش اس کا بنیادی مقصد رہا ہے جو اسے مقصدِ زندگی سے جوڑتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے اپنے وجود یا ذات کے اثبات کا ادراک حاصل ہو جاتا ہے۔ یوں انسان خود تفہیمی کی صورتحال سے گزر کر اپنے آپ کو منوانے کی غرض سے خود پر اعتماد کرنے لگتا ہے۔ جس سے وہ عرفانِ ذات حاصل کرتا ہے۔

وجودیت انسانی رویوں اور انسانی ذات کے اثبات سے متعلقہ موضوعات پر مشتمل ہے۔ یہ روایتی فلسفوں سے ہٹ کر وجود کے اثبات کے لیے کوئی سائنسی نقطۂ نظر نہیں اپناتی بلکہ خود شعوری کو اہمیت دیتے

ہوئے انسانی بقا کی بات کرتی ہے۔ انسانی بقا کے لیے مجرد فلسفیانہ مباحث سے انحراف کرتی ہے اور ایک نیا طرزِ فلسفہ اختیار کرتے ہوئے انسان کی آزادی، اس کے فیصلہ و انتخاب اور ذمہ داری جیسے موضوعات کو نئے سرے سے سمجھنے پر اکساتی ہے۔ آزادی ہی انسان کو اپنے انتخاب و عمل میں خود مختار کرتی ہے اور اسی آزادی کی بدولت فرد اپنی ذات کا اثبات کشید کرتا ہے۔ اور جہاں یہ اثبات ممکن نہ ہو وہاں نفسیاتی ہیجان پیدا ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ جو جبر اور تنہائی کی صورتحال پیدا کرتا ہے۔

تمام وجودی فلاسفر عقل کی مطلقیت سے انکار کرتے ہیں اور فرد کی فطرت کی بجائے اس کی ذات کے اثبات پر یقین رکھتے ہیں اور جذبے اور جذبی کیفیات کو اہم گردانتے ہیں۔ فرد کی داخلیت، احساس و جذبات کا مسکن ہوتی ہے۔ جذبے اور احساس کی یہ کیفیات نہ صرف فرد کو اپنے ہونے کا یقین دلاتے ہیں بلکہ فرد کو دنیا سے مربوط کرنے کا بھی ذریعہ بنتی ہیں اور وجودی فلاسفر اس رشتے کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہی جزبی کیفیت فرد کا رشتہ دنیا سے جوڑے رکھتی ہیں۔ کرب، اکتاہٹ، گھن / کراہت، مایوسی، تنہائی، جبر، بوریت، دہشت، امکان، لغویت، اضطراب، آزادی، بیگانگی، خوف وجودی کیفیات ہیں۔ وجودی فلاسفر انسانی کیفیات کو نفسیاتی نہیں سمجھتے، کیونکہ نفسیاتی کیفیات کا سائنسی تجربہ کیا جاسکتا ہے لیکن وجودی کیفیات کا سائنسی مشاہدہ ممکن نہیں
۔

جبر اور تنہائی کسی نہ کسی بگاڑ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جو وجودیت کے رجحان کا باعث بنے اور بعد میں وجودیت کا ہی حصہ بن گئے۔ یورپ کی فکری تاریخ میں فلسفۂ وجودیت کو امتیازی مقام جنگِ عظیم اول کے بعد ہی حاصل ہوا۔ روشن خیالی پروجیکٹ نے انسان کو روایتی دنیا سے کاٹ کر جدید دنیا میں شفٹ کیا تو اس کا اثر پورے یورپ پر پڑا۔ جس سے انسان کی مادی ضرورتیں بڑھتی گئیں اور انسانی ضرورتوں کا فقدان سر اٹھاتا گیا جو دنیا کی عظیم دو جنگوں کی صورت میں سامنے آیا۔ جس میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو موت کی گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرائے گئے۔ یہ سب عقل پرستی، سائنسی اعتماد کے نتیجے میں ہوا۔ صنعتی معاشرے نے انسانی شخصیت کو معدوم کر دیا۔ سائنس و ٹیکنالوجی اور عقل پرستی کے اس جبر کا زور بڑھتا چلا گیا جس کے ردِ عمل میں ان جبری قوتوں کے خلاف ایک فکری بغاوت ضروری سمجھی گئی۔ جو وجودی فکر کی صورت میں سامنے آئی۔

"وجودی فکر کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے بدلے ہوئے حالات میں نئے انسان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ آج کا فرد ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اسے خود نہیں معلوم کہ اسے کہاں جانا ہے اور اگلا قدم اس کا کس طرف اٹھے گا۔ علم کی روز افزا ترقی نے اسے آگہی کا کرب دیا ہے۔ وہ انسانوں کی بھیڑ میں اپنی زندگی کی معنویت اور انفرادیت پر جب غور کرتا ہے تو اسے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ وہ خود کو گم شدہ تصور کرتا ہے۔ نتیجہ کے طور پہ زندگی اس کے سامنے ایک سوالیہ نشان کے طور پر کام کرتی ہے۔ مشینی اور صنعتی تہذیب نے وجود کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے آج کا فرد مشین کا غلام ہے۔ بے حس و بے جان پرزے کی طرح وہ دن بھر کام کرتا ہے۔ اس کی انفرادیت باقی نہیں رہی ہے"۔ (۱۲)

وجودی فلاسفہ کو اس بات کا ادراک ہو گیا کہ عقل پرستی کی کوئی بھی جہت انسانی آزادی کو سلب کر لیتی ہے اس لیے انسانی آزادی کو سلب کرنے والی قوتوں کے خلاف بڑا زور دار ردِ عمل سامنے آیا۔ چنانچہ یہ رویہ عام ہونے لگا کہ مروجہ نظام فرد کی انفرادیت کے لیے سمِ قاتل ہے جو اسے مشین کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں جبر (Determinism) ، تنہائی (Solitude) اور بیگانگی (Estrangement) کا عمل دخل بڑھ رہا ہے۔ انسان مذہب سے بے گانہ ہو گیا ہے۔ ہر طرف ظلمت کے اندھیروں میں پھنسا ہے۔ انسانی تشخص پامال ہو چکا ہے۔ استعماری انسان کے ساتھ ساتھ خدا پر بھی یقین اٹھتا جا رہا ہے۔ گویا یہ سمجھا جانے لگا کہ روشن خیالی اور جدیدیت کا وہ پروجیکٹ جس نے انسان کی بھلائی اور فائدے کی بات کی تھی وہ بھی انسان کو سوائے مصیبتوں اور دکھوں کے کچھ نہ دے سکے اس لیے عقل پرستوں کے خلاف ایک ردِ عمل سامنے آیا جس نے انسانی تشخص کی آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ گویا وجودیت کے پیروکاروں نے فردِ واحد اور اس کے گوناں گوں مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ چنانچہ عوامی سطح پر اس فلسفے کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ جس کا بنیادی فلسفہ یہی ہے کہ انسان اپنے اعمال سے پہچانا جاتا ہے اعمال کی مجموعی ہیئت ہی اس کی زندگی ہے اور وہ وہی کچھ ہے جیسی اس کی زندگی ہے۔

جبر اور تنہائی وجودی فلسفے کی بنیادی اصطلاحات ہیں۔ جو کسی بھی فرد کے عدم تشخص سے پیدا ہونے والی داخلی کیفیات سے مملو ہیں۔ انسان کو جب خارج سے آزادی نہیں ملتی اور ایک جبر کا ماحول اس کی شخصیت کو سلب کرنے لگتا ہے تو پھر اپنی خود اثباتی کے لیے وہ اپنی ذات یعنی داخل سے رجوع کرتا ہے۔ ایسے میں وہ

خارج سے مکمل طور پر لا تعلق ہو جاتا ہے۔ لا تعلقی کا یہ بحران وجودیت کی اصل بنیاد ہے جو تنہائی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اور یہ تنہائی خود تفہیمی کے دوران ایک جبر کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ جو داخلی وارداتوں کو مہمیز کرتا ہے اور لا تعلقی کے بحران کو مزید تقویت دیتا ہے۔ لا تعلقی کا یہی بحران وجودیت کی بنیاد ہے۔ جس میں جبر اور تنہائی کے علاوہ کئی وجودی اصطلاحات سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان اصطلاحات میں دہشت، بوریت، مایوسی، عدمیت، موت، وابستگی، شرم، امکان، اضطراب، لغویت، آزادی، ذمہ داری، ضمیرِ خوش، ضمیرِ بد، نفی وانکار، واقعیت، جرم، ابہام، کتراہت، بیگانگی، برہنگی، خود کلامی، خوف، بدہیئتی، غیر معقولیت، التباس، ارادہ، ہستی، ہستی برائے ذات خود، ہستی بذاتِ خود، ہستی برائے دیگراں، سبب، انسان، خارجی انکار، داخلی انکار، محرک، وجودی مطالعاتی طریق کار، مظہریت، صورتِ حال، قدر وغیرہ کئی اصطلاحات وجودیت سے متعلقہ اور عام ہیں۔

> "وجودیت پسندوں کا مرکزِ فکر انسانی وجود اور اس کے مسائل ہیں۔ یہ مسائل انسان کے کرب، الجھن، کشاکش، بیزاری، تنہائی، علیحدگی، بے گانگی، خوف، دہشت، پشیمانی، پریشانی، مایوسی، محرومی، بے کسی بے چارگی لایعنیت، لغویت، اور بے مقصدیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسانی زندگی مہمل، اور لغو ہے اور اندھیرے میں بھٹک رہی ہے۔ وجودی مفکروں کا ایسا احساس ہے اس لیے وہ اس بات کے کوشاں نظر آتے ہیں کہ طرح زندگی کو بامعنی بنایا جائے"۔ (۱۳)

انسان جبر اور تنہائی کا شکار اس وقت ہوتا ہے جب اس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ یہ آزادی کسی بھی شے یا کام کی آزادی ہو سکتی ہے۔ وجودیت کا سب سے اہم پہلو یہی تصورِ حریت ہے۔ تصورِ حریت روایتی طرزِ فکر کو قبول نہیں کرتا اور اس کے خلاف شدید ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔ روایتی طرزِ فکر انسان کو مادیت، حقیقت، تجربیت، مذہبیت کے جال میں پھنساتا ہے اور اس کی آزادی کو غلامی میں بدل دیتا ہے جس کی مثال موجودہ دنیا سے لی جاسکتی ہے کہ انسان خود کار مشین کی صورت ایک Object / شے بن کر رہ گیا ہے۔ اور اسے اپنی ذات کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا۔ وہ حقیقت میں ایسے جبر اور تنہائی کا شکار ہے جس کا اسے خود بھی اندازہ نہیں ہے۔ آزادی کا تصور جب سلب ہوتا ہے تو انسان کے اندر بیگانگی، مغائرت اور اجنبیت کے اثرات پیدا ہونے لگتے ہیں جو نتیجتاً جبر اور تنہائی کا باعث بنتے ہیں۔ اور انسان بے حیثیت ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسان کی یہ بے حیثیتی اسے

عدمیت، معدومیت اور لایعنیت کی جانب لے جاتی ہے۔ اور انسان کو نیستی کے تصور سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ اس طرح انسان حسی اور جذباتی سطح پر مسلسل اضطراب کا شکار رہتا ہے۔ جس سے اس کے داخل میں انسانی سچائیوں اور برائیوں کے ٹکراؤ سے ابہام پیدا ہوتا ہے۔ جو اسے آزادی اور غلامی کے درمیان لٹکائے رکھتا ہے۔ بقول ڈاکٹر حیات عامر حسینی "وجودی مفکرین کے ہاں آزادی اور وجود ہم معنی ہیں بلکہ ایک ہی چیز بن جاتے ہیں یہ ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جاسکتے ورنہ دونوں بے معنی ہو جائیں گے"۔ (۱۴)

یہ ایک ایسا جبر ہے جس سے انسان خود کو تنہا کر لیتا ہے حالانکہ اس کے ارد گرد لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے اس کے باوجود وہ خود کو تنہا پاتا ہے اور ہمیشہ خود تفہیمی میں سرگرداں رہتا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر الٰہیاتی وجودیت کے قائل افراد کا طرزِ زندگی نظر آتا ہے۔ یہ ساری صورتحال جبر اور تنہائی کی ہے جس سے وجودی پیروکار مسلسل گزر رہے ہوتے ہیں۔ جبر اور تنہائی کی یہ صورتحال گبریل مارسل کے ایک ڈرامے کی ہیروئن کرسٹائن (Christiane) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ کہتی ہے:

> Don't you ever realize that we are living a life (if we can call it living) in a broken broken world, broken like a time clock, whose spring works? Stopped doing ... If you wear this watch with your ear, you will hear nothing but silence. This world of human beings ... He may have a heart someday, but let me tell you – his heart stopped beating. (15)

ترجمہ: "کیا کبھی کبھار تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ ہم زندگی بسر کر رہے ہیں (اگر ہم اسے زندگی بسر کرنا کہہ سکیں تو) ایک ٹوٹی ہوئی شکستہ دنیا میں، جو ایک وقت بتانے والی گھڑی کی طرح ٹوٹی ہوئی ہے، جس کے اسپرنگ کب کا کام کرنا چھوڑ گئے۔۔۔ اگر تم اس گھڑی کو اپنے کان کے ساتھ لگاؤ تو سوائے خاموشی تمہیں کچھ سنائی نہیں دے گا۔۔۔ انسانوں کی یہ دنیا۔۔۔ شاید کبھی اس کے پاس دل ہو، لیکن مجھے کہنے دو کہ اس دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہے"۔

سائنسی دور نے انسان کو جس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا وہاں وجودیت نے انسان کو جینے کا حوصلہ دیا۔ وہیں انسان ایک نفسیاتی ہیجان کا شکار بھی ہوا جو جبر اور تنہائی کی صورت میں اس کی زندگی میں سرایت کرتا گیا۔ انسان اس کائنات میں اپنی بے آسرا زندگی جینے لگا۔ سائنس و ٹیکنالوجی بھی اس جبر و تنہائی کا ازالہ نہ کر سکی۔ مشین کی گھمبیر آوازوں میں اس کی سسکیاں دب کر رہ گئیں اور انسان لایعنیت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مجبوری کی اس زندگی کا مداوا وجودیت نے انسان کو جبر اور تنہائی کی صورت میں دیا۔ جو فقط عرفانِ ذات پر منتج ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> "اس فلسفہ (وجودیت) نے بیسویں صدی کے ذہنِ انسانی کو اس کی ناامیدی، بے یقینی اور عدم اعتماد سے نجات دلا کر اپنی ذات پر اعتماد کرنا سکھایا، اس نے خیر و شر کی ساری ذمہ داری فرد کے کاندھوں پر ڈال دی اور بتایا کہ آدمی اس کے سوا کچھ نہیں جو وہ خود کو بناتا ہے۔ ذات کے عرفان کا مسئلہ ہم مشرقیوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں لیکن یورپ میں جہاں سائنس کی ترقی نے فلک افلاک کو چھو لیا تھا۔۔۔ عرفانِ ذات کے اس فلسفے نے بحران زدہ انسان میں زندگی کی روح پھونک دی"۔ (۱۶)

وجودیت نے انسان میں زندگی کی جو روح پھونکی ہے اس کا جبر اور تنہائی سے کیا تعلق ہے یا یہ کس حد تک انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اس کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔

ii۔ جبر (Determinism) کے ادبی، سماجی اور نفسیاتی مباحث

یورپ کی فکری تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو عقل پرستی، روشن خیالی پروجیکٹ اور جدیدیت نے ادبی و سماجی سطح پر جبر کی فضا قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور اس کے زیرِ اثر معاشرے میں نفسیاتی ہیجان پیدا ہوا جس نے غلامی، تنہائی، بیگانگی اور جبر جیسی صورتحال کو تقویت دی۔ جس سے انسان کو زندہ رہنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اور یہ مسئلہ جنگِ عظیم اول کے بعد زور پکڑ گیا۔ اس دوران وجودی فلاسفہ نے بھی اس صورتحال کو اجاگر کیا۔ انہوں نے انسانی زندگی کے مفروضات، خدشات اور وسوسوں کو موضوعِ بحث بنایا اور انسانی ذات یا شعورِ ذات جیسے مسائل سمجھنے کی کوشش کی۔ جبر کی یہ صورتحال انسانی وجود سے شروع ہوتی ہے۔ وہ وجود جو اس کائنات میں اپنی موجودگی سے پہلے لاعلم تھا اس کی لاعلمی اور اس کی ناگہانی موجودگی ایک جبر کی صورتحال پیدا کرتی ہے جو عرفانِ ذات میں مزاحمت پیش کرتی ہے۔ جوں جوں وہ اس کائنات میں ہوش سنبھالتا ہے اسے کئی

سوالات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور اپنے ارد گرد کے ماحول میں کمزور اور طاقتور، چھوٹے بڑے طبقوں کی تقسیم سے متاثر ہو کر خود کو بڑا بنانے اور طاقتور بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جوں جوں اس کے ارد گرد کی طاقتیں اس کے گرد کا دائرہ تنگ کرتی ہیں تو فرد کی اجتماعی طاقتیں ان طاقتوں کے خلاف یکجا ہو کر مزاحمت پیش کرتی ہیں۔ جو فرد کو مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ اپنے ارد گرد عوام سے بیگانہ کر دیتی ہیں۔ یوں وہ اس طاقت کی یکجائی میں اس قدر مصروف ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد ماحول اور لوگوں سے ماورا ہو جاتا ہے اور اس ماورائیت کے نتیجے میں وہ خود کو اکیلا کر لیتا ہے یوں وہ وجودی فکر کے مطابق یگانگت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس ساری صورتحال میں دیکھیں تو یہ مرحلہ ایک جبر کے ردِ عمل میں سامنے آیا اور اس سے انسانی ذات خود اپنے شعورِ ذات میں جبر کا شکار ہوتی گئی۔

وقت، تاریخ، زندگی اور تنفس کے تانے بانے یہ وہ عناصر ہیں جنہیں انسان چاہ کر بھی موڑ نہیں سکتا۔ اور ایک وجودی انسان انہی عناصر پر سوال اٹھاتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے اور کیا ہے؟ اور جب اسے معلوم پڑتا ہے کہ وہ انہیں چار عناصر کا محتاج ہے تو مجبور ہو جاتا ہے۔ بیگانگی اور گمشدگی اس کے لیے لازم ہو جاتی ہے۔ یہاں جبر انسانی ضرورت بن کر سامنے آتا ہے۔ جس میں زندگی مشروط ہے۔ سارتر کے بیشتر کردار مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اس زندگی سے چھٹکارا پانا چاہتے اور اسے جہنم سے کم نہیں سمجھتے لیکن زندہ رہنا بھی ان کی مجبوری ہے۔ انہیں زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوتا ہے۔ یہاں کرکیگارڈ کے مطابق انسان کو اپنی محرومیوں پر آنسو بہانے کی بجائے مسرت محسوس کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ جبر انسانی ضرورت بن کر اس کے سامنے کھڑا ہے۔ چاہے ڈیکارٹ کے بقول "میں سوچتا ہوں کیوں کہ میں ہوں"۔ کو مان لیا جائے یا پھر پاسکل کا یہ کہنا کہ "میں ہوں۔ اس لیے سوچتا ہوں"[17] کو مان لیا جائے، تو جبر دونوں صورتوں میں نظر آتا ہے۔ ایک میں شعور کا جبر اور دوسرے میں وجود کا جبر۔ دونوں انسان کی ضرورت اور مجبوری ہیں۔ کانٹ بھی انسان کو اس کائنات میں آزاد نہیں سمجھتا البتہ اسے روحانی طور پر آزاد سمجھتے ہوئے اعتراف کرتا ہے کہ باطن تک عقلی استدلال کی رسائی نہیں ہو سکتی۔[18]

ڈیکارٹ کے مطابق سچائی کی تلاش کسی خارجی مدد یا اتھارٹی کی طرف دیکھے بغیر بھی کی جا سکتی ہے وہ تمام علوم جو زندگی کی حقیقت جاننے کے لئے کافی ہیں ہم اپنی ذات کی منطقی گہرائیوں میں اتر کر حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈیکارٹ نے اپنے فلسفے کی بنیاد سائنسی اصول پر رکھی۔ اس سائنسی طریقہ کار میں ڈیکارٹ سوالیہ ذہن کے

ساتھ موجود ہے، نہ کسی چیز کو مانتا ہے اور نہ ہی اس سے انکار کرتا ہے بس غیر جانبدار رہتا ہے۔ ڈیکارٹ بڑے مسائل کو چھوٹے حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور یہ اصول مرتب کرتا ہے کہ ہر شہ کو شبہ کی نظر سے دیکھا جائے، اگر اس میں زرا سی بھی شک کی گنجائش ہو تو اس شے کو کلی طور پر مسترد کر دینا چاہیے۔ اگر ہم ایسا کریں تو تمام مادی اشیاء جن کا شعور ہمیں حواسِ خمسہ سے ہوتا ہے کسی خواب کی طرح غیر حقیقی دکھائی دیں گے کیونکہ جاگتے ہوئے ہمارے ذہین میں جو خیالات داخل ہوتے ہیں، وہی خیالات ہمارے ذہن میں نیند کے دوران بھی آسکتے ہیں۔ یعنی ہر وہ بات جو ہمارے ذہن میں داخل ہوتی ہے وہ ہماری خواب کی فریب کاریوں سے زیادہ سچی نہیں ہو سکتی۔ لیکن خواب دیکھنے کے لئے ضروری ہے کوئی خواب دیکھنے والا ہو، اس پر ڈیکارٹ پکار اٹھتا ہے " میں سوچتا ہوں لہذا میں ہوں "۔ ڈیکارٹ کہتا ہے کہ جب میں شک کرتا ہوں تو شک کرنے والے کے طور پر میرے وجود کا اثبات ہوتا ہے، میری تشکیک پسندی مجھے یقینی حقیقت تک لے جاتی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ میں وجود رکھتا ہوں۔

انسان کی آزادی کے سامنے جبر دیوار بن کر اس کے سامنے کھڑا ہے۔ کارل جیسپرز جو ایک وجودی مفکر ہے، انسان کو ابلاغی سطح پر آزاد، خود مختار اور بااعتماد دیکھنا چاہتا ہے۔ وجودی فکر انسان کی اسی آزادی پر استوار ہے کہ کسی بھی جبر کے خلاف مزاحمت پیش کی جاسکے اور "نہ" کہنے کی آزادی مل سکے۔ لیکن اس آزادی کے سامنے برکی وہ صورتحال درپیش ہے جو خوف مصیبت اور مت کا اختیاری روپ ہے۔ جن سے جبر نمایاں ہوتا ہے۔ کارل اس جبر کو تین صورتوں سے منسلک کرتا ہے۔ ایک معروضی / مادی، دوسری موضوعی / داخلی اور تیسری مطلق العنانی / کامل۔[19]

یہ تینوں صورتیں جبر کے ساتھ جڑی ہیں جو ادبی، سماجی، نفسیاتی یا کسی بھی سطح پر جبر کو تقویت دیتی ہیں۔ ان تینوں صورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ:

> "فیصلے کے بغیر انتخاب کچھ نہیں، ارادے کے بغیر فیصلہ کچھ نہیں، فرض کے بغیر ارادہ کچھ نہیں اور موجودگی کے بغیر فرض کچھ نہیں۔
>
> "No choice without decision, no decision without will, no wil without duty, no duty without being"[20]

دیکھا جائے تو کارل بھی وہی بات دہرا رہا ہے جو ڈیکارٹ اور پاسکل کہہ گئے ہیں۔ یہاں بھی وجود کا ہونا یا زندہ رہنا کہیں نہ کہیں مشروط اور مجبور ہے۔ جس سے انسان کی آزادی میں بھی جبر کی کیفیت ملتی ہے۔ جو کسی بھی انسان کے لیے تشویش کا باعث ہے کیوں کہ وہ آزادی پسند ہے۔ یوں انسانی وجود جب اس جبر کا شکار ہوتا ہے تو حزن و ملال اس کا اگلا پڑاؤ ہوتے ہیں۔ جو اسے بیگانگی اور تنہائی کے جبر میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

جبر سے چھٹکارے کے لیے سارتر نے تصورِ آزادی کا فلسفہ دیا۔ جو اس کی کتاب (Being and nothingness) کے چوتھے اور پانچویں باب میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ موجودگی اور عمل کو آزادی سمجھتا ہے، حرکت کو آزادی کی پہلی شرط قرار دیتا ہے، صورتحال کو آزادی کی واقعیت (Facticity) بیان کرتا ہے اور پھر ذمہ داری کو آزادی کا نتیجۂ فکر ثابت کرتا ہے۔ (۲۱)

سارتر کا انسانی آزادی کا یہ بیان بھی کسی نہ کسی مقصد اور شرط پر قائم ہے۔ کوئی بھی شے جو مشروط یا کسی مقصد کے تحت ہو وہ آزاد کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ بھی جبر کی ایک جدید شکل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارتر اس زندگی کو جہنم سے کم نہیں سمجھتا اور بیگانگی و تنہائی کے جانب قدم بڑھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی بے معنی ہے۔ کوئی اخلاقی قانون موجود نہیں۔ انسان مختارِ مطلق ہے اور وہ اس غلاظت کے ڈھیر یعنی دنیا میں اکیلا ہے۔ ادبی اور فلسفیانہ سطح پر سارتر کے ہاں جبر کی کیفیات یا صورتحال واضح نظر آتی ہے۔

سارتر کے بعد سے کئی ادباء نے سارتر کے خیالات سے استفادہ کیا اور ادبی سطح پر اس کے خیالات کو پیش کیا۔ انگریزی شاعروں میں ٹی ایس ایلیٹ، سارتر کی وجودیت کا نمائندہ سمجھا جا سکتا ہے اس کی نظم (Waste Land) انسانی زندگی کی بے معنویت کی اچھی مثال ہے۔ اس کے بعد سیمون ڈی بوار (Simone de Beauvior)، البرٹ کامیو (Albert Camus)، کولن ولسن (Colin Wilson) وغیرہ اہم ہیں۔

پاکستان میں جبر کی صورتحال تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔ جہاں ایک طرف آزادی کی نوید تھی دوسری جانب اس سے پیدا ہونے والی صورتحال نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک ایسی فضا قائم کی جس سے انسانی زندگی تلخ سے تلخ تر تاریخ رقم کرتی گئی۔ آزادی کے دوران شخصی سطح پر ایسی اکھاڑ پچھاڑ کی گئی کہ ہجرت اور اس کا ناسٹلجیا ادب کا حصہ بن گیا۔ بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کے درمیانی عرصے میں فرانس اور جرمنی جس سیاسی، سماجی اور معاشی عذاب سے گزرے تھے ۱۹۴۷ء کا پاکستان اور ہندوستان اسی دہانے پر

کھڑے تھے۔ ماضی میں بھی یہ خطہ انگریزوں کے جبر و تسلط کا شکار ہوتا رہا۔ گویا زندگی کا وہ بحران تقسیم سے پہلے تھا وہی بحران شدت کے ساتھ تقسیم کے بعد بھی عروج پر تھا۔ اب مسئلہ لسانی تنافر، تہذیبی و ثقافتی مغائرت اور مذہبی جاہ و جلال کا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے سابقہ روایت سے انحراف کیا۔ اور یوں ترقی پسندی کے بعد سے ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی جیسے نعرے ادب کو بھی طبقات میں تقسیم کرتے چلے گئے جس سے ادبی سطح پر جبر کی صورتحال نے مزید زور پکڑ لیا۔ وہ جبر جو سماجی، سیاسی اور تہذیبی سطح شروع ہوا تھا اب ادبی سطح پر جبر کی اس صورتحال کی عکاسی ہو رہی تھی۔ ابتدائی سطح پر اس کا اظہار وجودی شاعروں کے ہاں ملتا ہے جس میں اقبال چند اردو نظمیں، راشد کی بیگانہ، میراجی کی دائرے کی الجھنیں، فیض اور احمد ندیم قاسمی اجتماعی وجودیت، مجید امجد کی نظموں میں علامت، منیر نیازی کا "میں"، وزیر آغا کا "وجود نا معتبر"، انیس ناگی، کشور ناہید وغیرہ نے وجودی سطح پر اسی جبر کو پیش کیا جو انسانی شخصیت کو مسخ کرتا چلا آرہا ہے۔ اور جس نے نفسیاتی سطح پر بھی بگاڑ پیدا کر دیا۔ ایہام گوئی کی تحریک اسی جبر کا نتیجہ ہے جس میں شکایت کرنا اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھانا جرم سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایہام گوئی تحریک، علامت و تجریدیت کے پس منظر میں جبر کی وہ صورتحال ہے جو انسان پر ابھی تک بیت رہی ہے۔

سماجی سطح پر یہی جبر انسان کی نفسیات کا حصہ بنتا چلا گیا۔ تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو تاریخ جنگوں اور قتل و غارت سے بھری پڑی نظر آتی ہے۔ بہت پیچھے نہیں جاتے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر اب تک برصغیر پاک و ہند میں انہی جنگوں اور زور زبردستی کی صورتحال سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر دکھائی دیتی ہے۔ 1600ء سے لے اب تک چار سو سال کسی قوم کا اس جبر کی صورتحال میں مسلسل رہنے سے انسان نفسیاتی سطح پر ہیجان کا شکار نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس خطے کے زیادہ تر لوگ ایک اندازے کے مطابق نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ وہ جبر جو سیاسی سطح سے شروع ہوا تھا۔ سماجی سطح پر آتے ہی اس نے انسان کو انفرادی سطح پر متاثر کیا اور آج حالت یہ ہے کہ بہ حیثیت ایک قوم بھی ایک پلیٹ فارم پر ہونا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ اس انتشار سے زندگی کا بحران انفرادی سطح پر زور پکڑتا گیا اور اور ہر شخص اپنی ذات کی پہچان اور اس کے عرفان کے لیے اپنے داخلی ذات سے رجوع کرنے پر مائل ہوا۔ یوں خارجی ماحول انسان کے داخل کو بھی متاثر کرنے لگا۔ جس سے شخصیت میں نفسیاتی سطح پر بھی بدلاؤ آیا۔ اور یوں آزادی کے بعد بھی انسان اس کشمکش میں نظر آتا

ہے کہ وہ آزاد ہے بھی یا نہیں۔ تقسیمِ ہند سے لے کر ۱۹۷۰ء تک انسان اپنی ذات کے عرفان کے لیے عام طور پر اسی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس صورتحال کی عکاسی ڈاکٹر غلام جیلانی اصغر نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "معاشرہ زندگی اور آدمی ایک بنیادی اور دائمی تثلیث ہے۔ اس تثلیث کے کچھ پہلو ایسے ہیں جو اپنی مجرد صورت میں انسانی فہم کی گرفت میں نہیں آ سکے۔۔۔ آدمی یا فرد اضداد کا مجموعہ ہے وہ اپنے آپ پر پابندی عائد بھی کرتا ہے اور خود ساختہ پابندی کے خلاف بغاوت بھی کرتا ہے۔۔۔ دراصل اس تثلیث کا تعلق تاریخ کے کسی خاص دور سے نہیں۔ ہر دور اور کم و بیش ہر ملک فکری طور پر اس بنیادی تثلیث کی تکرار کرتا ہے۔ انسان اپنی بساط کے مطابق اس معمے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ انسان آزاد ہے یا مجبور محض۔۔۔ اسی اندازِ فکر سے ایک نئے شعور کا پتہ چلتا ہے"(۲۲)

اس صورتحال میں جب انسان کو اپنے مسائل کا حل خارج سے نہیں ملتا تو وہ فطری طور پر داخل سے رجوع کرتا ہے۔ جو ظاہر ہے مجبوری کی حالت میں اپنے آپ کو تنہائی اور دوسرے لوگوں سے الگ کر لینے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ جسے جبریت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اطہر رشید اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "جب تک انسان اپنے تئیں کسی قابل تعئین عنصر کے حوالے سے نہیں پہچانتا وہ جبریت کا شکار رہتا ہے اور آزاد نہیں ہوتا۔ یوں اپنی ذات سے برگشتہ رہتا ہے، باطنی زندگی میں خارجی عنصر سے آزاد ہو کر ہی انسان حقیقی تحفظ اور مطلقیت حاصل کرتا ہے۔ انسان کا عمیق جوہر ہر قسم کے قابل تعیین مشتملات سے ماوراء ہے اور اس کی دریافت قابلِ تعئین مشتملات کی حامل ہر شے کے خاتمے سے ہوتی ہے۔۔۔ جو محفوظ رہتا ہے وہ وجود ہے"۔(۲۳)

جبر کی یہ صورتحال جس سے انسان آزادی کا خواہش مند ہے وہ آزادی کے بعد بھی ایک ایسی جبری فضا میں رہ رہا ہے جہاں وہ خارج کے جبر سے آزاد ہو کر بھی داخل کے جبر میں مبتلا ہے لیکن اس جبر کو وہ آزادی سے تشبیہ دیتا ہے۔ جو کہ ایک نفسیاتی ہیجان ہے۔ اس نفسیاتی ہیجان نے انسان کو کس قدر اکیلا کر دیا ہے اور اس کا ادب و سماج پر کیا اثر پڑتا ہے ذیل میں اس کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

iii۔ تنہائی (Solitude) کے ادبی، سماجی اور نفسیاتی مباحث

جس طرح جبر وجودیت کا حصہ ہے اسی طرح وجودی انسان کے لیے تنہائی اس کا بیش قیمت سرمایہ حیات ہے۔ انسان آزاد خیال ہے۔ اور اس آزادی خیالی کے لیے جب انسان کو خارج میں قید و بند کی صعوبتوں سے واسطہ پڑتا ہے تو فطری طور پر اسے داخل سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ تنہائی کا ایسا گوشہ ڈھونڈ رہا ہوتا ہے جس میں وہ آزادی کا سانس لے سکے۔ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ سماجی سطح پر پیدا ہونے والی ابتری، انتشار و افتراق کی صورتحال انسان کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ اس کے باطن میں ایک ہلچل بھی پیدا کر دیتی ہے۔ ایسی معروضی صورتحال جس میں انسان خود مجبور و لاچار ہو جائے اپنے من کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ جب وہ اپنے من کی دنیا میں ایک گھر یا تنہائی کا گوشہ بنالیتا ہے تو وہ ایک لحاظ سے اپنی موضوعیت کا قائل بن جاتا ہے۔ اور اسی موضوعیت کے تحت وہ سوچنے سمجھنے لگتا ہے۔ اس نئی سوچ و آگہی سے ایک نئی سماجی صورتحال پیدا ہوتی ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ اپنی آزادی کی جنگ چاہے وہ داخلی سطح پر ہو یا خارجی سطح پر، لڑتا رہتا ہے۔ اور سماج سے لاتعلق ہو کر تنہائی میں ہمیشہ اپنا عرفان تلاش کرتا رہتا ہے۔ برصغیر کی تاریخ انسانی تنہائی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ یہ تاریخ جس اخلاقی انحطاط سے گزری اس میں انسان کا تنہا ہونا عام بات تھی۔ جس وجودیت کی تحریک سامنے آئی۔ جو دکھوں اور مصیبتوں سے گھرے انسان کا تعلق خارج سے منقطع کرتے ہوئے، تنہائی اور بیگانگی کی جانب لے گئی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سی۔ اے قادر کہتے ہیں:

> "وجودیت کا فلسفہ تنہائی اور بیگانگی یا غیریت کا فلسفہ ہے۔ یہ اس دور کی پیداوار ہے جب انسان اپنی تمام اقدار کھو بیٹھتا ہے۔۔۔ یہ دور یورپ میں عالمی جنگوں سے پیدا ہوا۔ انسان وحشیوں اور درندوں کی طرح لڑا۔ ہر قدر کو ٹھکرا دیا گیا۔ نہ اخلاق کا پاس رہا، نہ مذہب کا۔۔۔ جنگوں نے اخلاق اور مذہب دونوں کو تباہ کر دیا۔ نوجوانوں کو احساس ہوا کہ ماضی کا اخلاق ان کے مسائل حل نہیں کر سکتا۔ اور مذہب کی طفل تسلیاں ان کی بے چینی کو دور نہیں کر سکتیں۔ اگر پرانی اقدار ختم ہو چکیں، مذہب ناکارہ ہو چکا ہے اور فلسفہ دور از قیاس باتوں کا مجموعہ بن گیا ہے تو انسانی درد کا مداوا کیا ہے؟ ااس سوال کا جواب وجودیت نے پیش کیا"۔ (۲۴)

مشرقی سماج بھی اسی انحطاط اور زوال کا شکار رہا۔ جہاں اخلاقیات کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ انسان زندگی کو پامال کیا گیا۔ تمام اخلاقی، سماجی و مذہبی اقدار کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کسی بھی انسان کا گلا کاٹنا اور خون بہانا بہادری سمجھا جانے لگا۔ زندگی کا یہ بحران برصغیر میں رواج پا گیا اور اس کے سبب جنگوں سے تاریخ لکھی جانے لگی۔ ہر طرف مایوسی و ابتری کا ماحول تھا۔ انسان اپنی بقا کی جنگ لڑتا رہا اور تنہا ہوتا گیا۔ اس تنہائی پر وجودیت نے زیادہ زور دیا۔ جس نے اس ابتر انسان کو عرفانِ ذات کے لیے اکسایا تاکہ خارجی انحطاط سے نکلا جا سکے۔ قاضی جاوید حسین لکھتے ہیں:

> "یہ ابتری و مایوسی تسلیم شدہ روایات کے خلاف بغاوت، مادہ پرستی کا تخیل، فکر، ادب و فن میں جذبہ و وحدت کا انتشار، عدم تحفظ کا احساس، سماجی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی و جمالیاتی اقدار کی شکست و ریخت، جن سے ہماری ثقافت صورت پذیر ہوتی ہے، نے وجودی فلسفے کو کام مواد فراہم کیا"۔ (۲۵)

انسان جب تنہا ہوتا ہے اور اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے میں مگن ہو جاتا ہے تو اسے کئی طرح کے سوالات سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی سے ذات سے متعلق مخمصے کا شکار رہتا ہے اور ساری زندگی یہ جاننے میں مصروف رہتا ہے کہ وہ کون ہے اور اسے اس دنیا میں کون لایا ہے۔ وہ ہمیشہ خالق کی جستجو میں رہتا ہے۔ اور جب خالق کا اثبات اسے نظر نہیں آتا تو وہ اس سے بھی مایوس ہو جاتا ہے اور اپنی ایک الگ تھلگ دنیا بنا لیتا ہے۔ پھر وہ اپنے وجود اپنی ذات کے مقصد کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ وہ سوال اٹھاتا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ اور اس مقصد کے ساتھ جڑی سماجی، ثقافتی و تہذیبی شرائط کے بارے میں غور کرنے لگتا ہے۔ اور اپنے وجود کی اقدار کا تعین کرنے لگتا ہے۔ اور اپنی ذاتی زندگی، ذاتی آزادی، ذاتی گناہ، و ثواب، ذاتی انتخاب، ذاتی حزن، ذاتی اخلاق، ذاتی روابط، ذاتی موت اور ذاتی نجات کے بارے میں سوال اٹھاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تنہا انسان اپنا مرکزہ تلاش کرتا رہتا ہے۔ جس سے جبر کی صورتحال کے ساتھ ساتھ تنہائی کی کیفیت اور مایوسی جیسے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

ادب میں تنہائی کے عناصر وجودی مصنفین کے ہاں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ کیرکیگارڈ کے طنزیہ اسلوب میں، نطشے کے "زرطشت" (Zarathustra) کی تنہائی اور دیوانہ فرزانگی میں، دوستوسکی (Dostoevsky) کے "تہ خانے کے آدمی" (Man from underground) میں، سارتر کے ناول ناسیا

(Nausea) میں مندرج منافقت (Bad Faith) میں، کامیو کی سسی فس کی کہانی (Story of sisy-phus) میں تنہائی، بیگانگی، یگانگت اور ماورائیت کی تمثیلیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو عدم شخصیتی کا باعث بنتی ہیں۔ عدم شخصیتی اور تنہائی کی یہ صورتحال صنعتی معاشرے نے پیدا کی ہے۔ جس میں انسان کے بجائے مادی اشیاء کی اہمیت زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عام انسان کو اپنی ذات کے علاواہ کوئی درماں نظر نہیں آیا اور اس نے اپنی ذات کو ہی اپنی تنہائی کا گوشہ بنالیا۔ جس سے اس کی فردیت پسندی کو فروغ ملتا ہے۔

تنہائی اور فردیت پسندی کا یہ فلسفہ سارتر کے ہاں خود مرکزیت کی حیثیت سے اجاگر ہوتا ہے۔ جو اس تصورِ آزادی پر منتج ہے۔ وہ تنہائی پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "کسی شخص کے طرزِ عمل سے اس کی ذہنی واردات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کیوں کہ ہر شخص تنہائی، ذہنی کرب اور فریبِ نفس میں مبتلا ہے دوسرے لوگوں کی موجودگی ایک طرح کا جہنم ہے"۔ (۲۶)

دراصل یہ اجنبیت کا رویہ ہے۔ انسانی آزادی، انسانی تنہائی اور خود فیصلگی کا ردِ عمل بیگانگی، اجنبیت اور لاچارگی ہے۔ اجنبیت کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی بے چینی یا اضطراب کار فرما رہتا ہے۔ یہ اضطراب سماجی، سیاسی، نفسیاتی یا ادبی اعتبار سے مختلف ہو سکتا ہے لیکن اس کا نتیجہ تنہائی اور اجنبیت کی صورت میں ہی سامنے آتا ہے۔ اجنبیت کا احساس اضطراب کی شدت میں جس قدر اضافہ کرتا ہے اسی قدر انسان تنہا ہوتا جاتا ہے۔ اور خود کو اس دنیا سے بیگانہ کر لیتا ہے۔ اندر ہی اندر اپنی ایک الگ دنیا تخلیق کر لیتا ہے۔ اور اپنی مجموعی طاقت کو اپنی ذات کے عرفان میں صرف کرت کرتے عمر گزار دیتا ہے۔ انسان کو اجنبیت احساس اس وقت سے ہے جب سے وہ پیدا ہوا۔ اجنبیت اور تنہائی کے اس احساس کی شدت میں مزید اضافہ صنعتی انقلاب نے کر دیا۔ لوگ شہروں میں نقل مکانی کرنے لگے۔ مشینوں کے بے دریغ استعمال نے انسانی رشتوں کو مجروح کیا اور انسان مشینوں کے سامنے بے بس نظر آنے لگا۔ کافکا اور دوستووسکی کی تحریروں میں اجنبیت اور تنہائی کی اس صورتحال کی عکاسی نظر آتی ہے۔

تنہائی پسند انسان دراصل اپنی ذات کو اہمیت دیتا ہے اور اسے نفی کرنے والے عناصر کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ہی ایک ایسی دنیا بنالیتا ہے جس سے وہ ساری دنیا فتح کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ یہ رویہ دو طرح سے سامنے آتا ہے ایک وہ رویہ جس میں وہ اپنے عرفانِ ذات کو مرکزہ مان کر بقیہ زندگی گزار دیتا ہے دوسرا یہ کہ

وہ اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کے بعد اپنی مجموعی طاقت سے بڑی طاقتوں کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔ لیکن ایسا کم کم دکھائی دیتا ہے۔ عام طور پر تنہائی وجودی مفکرین کا مقدر بن جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> "وجودیت نے فرد کی شخصیت میں نفی کو اجاگر کیا تھا لیکن فرد اپنی انفرادیت میں ایک جزیرہ ہوتا ہے۔ جو انسانی سماج کے سمندر میں تنہا ہوتا ہے یا پھر اکیلا شجر جو انسانوں کے جنگل میں تنہا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ تنہائی ہی اس کی زندگی اور مقدر ہے۔۔۔ وہی نظیر اکبر آبادی والی بات۔۔۔ آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا"(۲۷)

یہ بات تو طے ہے کہ تنہائی وجودیت کی ایک اصطلاح کے طور پر سامنے آتی ہے۔ لیکن اس کے محرکات وجودیت ہیں یا نہیں، یہ بات غور طلب ہے۔ اگر اس تنہائی محرکات کی جانب قدم بڑھائیں تو اس ماحول اور اس عہد کا احاطہ کرنا ہوگا جس نے ادبی، سماجی و نفسیاتی سطح پر انسان کو تنہائی اور جبر کا شکار کر دیا ہے۔ مغرب جس طرح دو عظیم جنگوں کے باعث انسانی پامالی کا شکار رہا ہے اسی طرح مشرقی ممالک بھی جنگوں کی بھینٹ چڑھتے رہے۔ خاص طور پر پاک و ہند کی تقسیم نے لوگوں کو سماجی و نفسیاتی طور پر ہیجان زدہ کر دیا۔ لوگوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر دور دراز جگوں پر ہجرت کرنی پڑی۔ یہ وہ دور تھا جب مخالفین ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اور جن کا کوئی قصور بھی نہ تھا وہ بھی اپنی جان گنواتے چلے گئے۔ یہ ایسی صورتحال تھی کہ ہر کسی کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت بوڑھے ہوں یا جوان یا بچے سبھی کے خون سے آزادی کا پرچم رنگا گیا۔ آزادی کی صبح جہاں خوشیوں کی نوید بن کر روشن ہوئی دوسری طرف خون ریزی سے پیدا ہونے والی انتشار اور بے چینی کی صورتحال نے ایسا ماحول بنا دیا جس میں ہر انسان ایک دوسرے سے ڈرنے لگا۔ انسان انسانوں سے ڈر کر کہیں چھپ رہے تھے تو کہیں بھاگ رہے تھے۔ اس دور نے بھی انسان کو سماجی سطح پر بالکل تنہا کر دیا تھا اور اس نے اس کے سدِباب کے لیے اپنے باطن سے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ جس کے اثرات پاکستان بننے کے پچیس تیس سال بعد تک علامتی، تجریدی اور ایہام گوئی کی صورت میں نظر آتا ہے۔

اس ساری سیاسی و سماجی صورتحال میں جب انسان کو اس بات کا ادراک ہوا کہ صنعتی و عقلی دور نے انسان کی اقدار کو پامال کیا ہے تو اس وقت انسان اپنی ذات یعنی اپنی موضوعیت کی جانب متوجہ ہوا۔ موضوعیت انسان کی باطنی کیفیت کا نام ہے جس کا عرفان حاصل کر کے انسان اشیاء کا شعور حاصل کرتا ہے۔ یہ عمل تنہائی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وجودی مفکرین جب اپنی موضوعیت کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو وہ تنہائی کا

بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تنہائی بعض اوقات ان پر جبر کی صورت میں لازم ہو جاتی ہے۔ جو بعد میں ایک کرب کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ یہ کرب انسان کو مزید تنہا کر دیتا ہے۔

انسان کی بے حیثیتی بھی اسے سماجی سطح پر تنہا کر دیتی ہے۔ بے حیثیتی دراصل انسان کی آزادی کو سلب کرتی ہے۔ اس سلبیت کے باعث انسان کے اندر تنہائی و بیگانگی، مغائرت اور اجنبیت کے اثرات پیدا کرتی ہے۔ لاتعلقی جس کا ایک پہلو ہے۔ لاتعلقی بھی انسان کو تنہائی کی جانب دھکیلتی ہے۔ جس نے وجودیت کے لیے خام فکر مہیا کی۔ تنہائی و مایوسی کی یہ صورتحال وین گرڈ (Vanguard) کی مصوری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ایک وجودی ڈرامہ نگار اونسکی (Ionesco) نے تنہائی اور جبر کے محرکات کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> I feel like life is an unbearably painful nightmare. Look around you, there is war, there are disasters, there are catastrophes, there is hatred. There is oppression, there are contradictions, there is death ... This world is not our real world. (28)

> ترجمہ: "مجھے محسوس ہوتا ہے زندگی ایک ناقابلِ برداشت اذیت ناک ڈراؤنا خواب ہے۔ اپنے ارد گرد دیکھیئے، جنگ ہے آفتیں ہیں، تباہیاں ہیں نفرت ہے۔ جبر ہے تضادات ہیں موت ہے۔۔۔ یہ دنیا ہماری حقیقی دنیا نہیں ہے"

ڈرامہ نگار کے اس بیان سے تنہائی کے وہ سارے محرکات سامنے آجاتے ہیں جو انسان کو سماجی سطح پر عدمیت اور بے حیثیتی جیسی صورتحال سے دوچار کرتے ہیں۔ عدمیت اور بے حیثیتی کے یہی تجربات ہمیں دوستووسکی، گبیریل گارسیامارکیز اور کافکا کی تحریروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جو کہ سماجی و نفسیاتی ذہن کی عکاس ہیں۔ فرد کی بے معنی زندگی میں ذاتی آزادی، ذاتی اعتماد اور ذاتی امنگ کے زوال کے بعد تنہائی ایک لازم نتیجے کے طور پر انسان کے درپیش رہتی ہے۔ اس میں بڑا کردار سماجی و سیاسی سطح پر جبر کا ہے۔ جو انسان کے تصورِ آزادی کو سلب کرتا ہے۔ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے لیکن یہ حق جب چھین لیا جائے تو اس کے ردِ عمل میں انسان یا تو مزاحمتی کردار بن جاتا ہے یا پھر اپنی ذات کے عرفان کے لیے اور درپیش مسائل کے حل کے لیے

تنہائی اختیار کر لیتا ہے۔ اور اپنی ساری قوتیں جمع کرنے میں مگن ہو جاتا ہے۔ یہ صورتحال تنہائی کو جنم دیتی ہے۔

ج۔ شفیق انجم کی سوانح و شخصیت

i. مختصر کوائف اور شخصیت

حافظ، نقاد، محقق، نثر نگار، مدرس، اور دانشور، پروفیسر، شفیق انجم کی پیدائش ۱۱ ستمبر ۱۹۷۹ء میں ایک متوسط طبقے کے مسلمان گھرانے میں گاؤں ''علی بیگ'' میں ہوئی۔ ڈاکٹر شفیق انجم کے آباؤاجداد شروع سے ہی اس گاؤں کے رہنے والے تھے۔

''علی بیگ'' آزاد کشمیر کا سرحدی گاؤں ہے۔ ضلع اور تحصیل کے لحاظ سے اس کا شمار ''بھمبر'' میں ہوتا ہے۔ بھمبر آزاد کشمیر کا ایک ضلع ہے اور یہ میرپور ڈویژن میں شامل ہے۔ بھمبر کو ضلع کا درجہ ۱۹۹۶ء میں ملا۔ ضلع بھمبر کی تین تحصیلیں ہیں جن میں بھمبر سماہنی اور برنالہ شامل ہیں۔

شفیق انجم کے والدِ محترم محمد فاضل اپنے علاقے کی ایک نیک نام شخصیت ہیں۔ آپ کے دادا دادی آپ کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ لیکن نانا، نانی کو آپ نے حیات پایا۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام نذیر بیگم ہے جو ایک گھریلو خاتون ہیں۔ شفیق انجم نے بچپن کی شامیں اپنے نانا کے ساتھ گزاری۔ آپ کے نانا ایک بہت اچھے داستان گو تھے۔

آپ کے والدین علم و ادب سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ بس بنیادی دینی تعلیمات کی حد تک آگاہ تھے۔ لہذا آپ کا تعلق کسی ایسے خاندان سے نہیں جو بہت تعلیم یافتہ ہو لیکن اس کے باوجود بھی آپ نے نہ صرف اعلی تعلیم حاصل کی بلکہ علم و ادب کی دنیا میں بھی ایک نام پیدا کیا۔

آپ کے آباؤاجداد کا تعلق زراعت پیشہ خاندان سے ہے جن کا کام کاج کھیتی باڑی اور مال مویشی پالنا ہے۔ کھیتوں میں کام کرنا، سرسبز و شاداب لہلہاتے کھیت، ایک فرحت بخش فضا پیدا کرتے ہیں جو ایک عام شہری زندگی کی نسبت انسان کو تر و تازہ محنتی اور صحت مند زندگی عطا کرتے ہیں۔ اس خوبصورتی اور تر و تازگی

کی ایک اپنی فطری اہمیت ہے۔ ہر چند کے یہاں سہولیات شہر کی طرح میسر نہیں ہوتی مگر دیہات کی خالص آب وہوا اور خالص خوراک دونوں دیہات کے ماحول اور طرز رہائش کو منفرد اور صحت مند بناتے ہیں۔

شفیق انجم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خاندانی میراث کو برقرار رکھتے ہوئے ایک مدت تک کھیتوں میں کام کیا اور مال مویشی بھی پالے۔ آپ نے فطرت کو بہت قریب سے دیکھا ہے، فطری حسن سے آپ کو خاصہ لگاؤ اور دلچسپی ہے۔ کھیتی باڑی اور مال مویشی پالنے کے علاوہ آپ کے والد محترم کی ایک دکان تھی جس میں اپنے بھائیوں کے ساتھ آپ بھی کام کرتے تھے۔ جو اس وقت کا بہترین ذریعہ معاش تھا۔

شفیق انجم سات بہن بھائی ہیں جن میں چار بہنیں اور دو بھائی شامل ہیں۔ یہ سب شادی شدہ ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں میں آپ سب سے چھوٹے اور لاڈلے تھے۔ آپ کے سب سے بڑے بھائی محمد رفیق آپ کے خاندان کے پہلے تعلیم یافتہ شخص ہیں جنہوں نے تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ زراعت سے ہٹ کے ملازمت اختیار کی اور ایک سکول میں علم و تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔ آپ کے خاندان میں آپ کے بڑے بھائی کی وجہ سے ایک بڑی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ ایک عرصہ تک تدریس کے فرائض سرانجام دینے کے بعد بڑے بھائی کی شادی ان کے ماموں کی بیٹی سے ہوئی اور وہ انگلینڈ چلے گئے۔ جس کے بعد معاشی حوالے سے ان کے زندگیوں میں نمایاں فرق پڑا۔ ڈاکٹر شفیق انجم کے دوسرے بھائی محمد صدیق نے بھی بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تعلیم حاصل کی۔ اور بعد ازاں گورنمنٹ ڈگری کالج میں انگریزی کے استاد بنے۔

شفیق انجم نے مڈل تا میٹرک تعلیم اپنے گاؤں میں ہی گھر کے قریب گورنمنٹ اسکول سے حاصل کی ۔ یہ سکول مڈل تک کے طالب علموں کے لیے تھا۔ لیکن آپ کی خوش قسمتی تھی کہ جب تک آپ نے مڈل کا امتحان پاس کیا اس سکول کو ہائی سکول کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ ۱۹۹۴ء میں آپ نے اسی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ پہلی جماعت سے میٹرک تک لگاتار اول آتے رہے ۔اسی بنا پر میٹرک میں BISE ''میرپور آزاد کشمیر'' کی طرف سے پہلی پوزیشن حاصل کرنے پر آپ کو گولڈ میڈل سے بھی نوازا گیا۔

میٹرک کے بعد مزید تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھانے سے قبل مذہبی لگاؤ اور دلچسپی کی بنا پر پہلے قرآن پاک حفظ کیا کیونکہ یہی آپ کے والدین کی خواہش بھی تھی ۔ دینی تعلیم سے خاص رغبت اور والدین کی

خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ نے "مدرسہ دار العلوم محمدیہ نظامیہ" سے تین سال میں قرآن پاک حفظ کیا۔ ذہانت اور لگاؤ کا یہ عالم ہے کہ آغاز کے پہلے ہی سال آپ نے ۲۶ سپارے حفظ کر لئے تھے۔

خاندانی دینی پس منظر کی بنا پر مذہب سے لگاؤ آپ کو بچپن سے ہی تھا۔ اس کی ایک اور وجہ آپ کے گھر کے قریب مسجد کا ہونا اور مسجد سے آنے والی تلاوت کی آوازوں کا آپ کے دل کو چھو لینا بھی تھا۔ بچپن سے ہی آپ بھی اس مسجد میں جاتے اور تلاوت سیکھتے رہے اور زیادہ وقت مسجد میں ہی گزارتے تھے۔ مسجد کی صفائی وغیرہ کا خاص خیال رکھتے مسجد کے پاکیزہ ماحول سے اس حد تک مانوس تھے کہ مسجد کو اپنا مستقل ٹھکانہ سمجھتے اور زیادہ وقت مسجد میں گزارتے تھے۔ قرآن پاک حفظ کے تین سال بعد آپ کی دستار بندی ہوئی۔

دینی تعلیمات حاصل کرنے کا آپ کے دل میں اتنا رجحان تھا کہ قرآن پاک حفظ کر لینے کے باوجود بھی مزید مذہبی تعلیم کے حصول لئے مدرسہ دارالعلوم گلزارِ حبیب میں داخلہ لے لیا کیونکہ اس کو ایک بہترین مدرسہ تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجوہ آپ نے یہ مدرسہ چھوڑ دیا، جس نے آپ کی سوچ اور زندگی کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔

یہاں آپ کی مذہبی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ یہاں سے فراغت کے بعد آپ نے گورنمنٹ ڈگری کالج میں داخلہ لیا اور BISE میرپور بورڈ کی طرف سے ۱۹۹۹ء میں انٹر کے امتحان میں تیسری پوزیشن حاصل کی اس پر آپ کو برونز میڈل سے نوازا گیا۔ بی۔ اے بھی آپ نے اسی کالج سے ۲۰۰۱ء میں مکمل کیا اس وقت یہ کالج آزاد کشمیر یونیورسٹی کے ساتھ منسلک تھا۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ مزید اعلی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن اس کے لئے آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ آپ کے والدین مزید تعلیم کے حق میں نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ آپ دیہات میں ہی کام کاج سنبھالیں۔ آپ نے مزید تعلیم کے حصول کے لیے گھر والوں کو راضی کرنے کی بہت کوشش کی اور اس ضمن میں اپنے کالج کے اساتذہ سے مدد بھی لی جس پر والدین نے مجبوراً انہیں اجازت تو دے دی لیکن فیس اور اخراجات دینے سے انکار کر دیا۔

اس انتہائی مشکل صورتحال کے باوجود بھی آپ کے تعلیم حاصل کرنے کے جذبے میں کمی نہ آئی، اور آپ اپنے گاؤں سے اسلام آباد آ گئے۔ یہاں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز میں ایم۔ اے (اردو) میں

داخلہ لیا اور سخت محنت کے بعد اعلی نمبروں سے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ جس پر ایک مرتبہ پھر آپ گولڈ میڈل کے حق دار ٹھہرے۔ ۲۰۰۳ئمیں آپ ایم۔ اے (اردو) کا امتحان پاس کر کے واپس اپنے گاؤں لوٹ گئے۔ ایم۔ اے (اردو) کے بعد بھی مزید تعلیم کے حصول کے لئے آپ نے ایم۔فل کرنے کی نیت کی اور دوبارہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد میں داخلہ فارم جمع کروا دیا۔ یہاں آپ کے اساتذہ نے آپ کی تعلیمی قابلیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایم۔فل کی بجائے پی ایچ ڈی میں داخلہ دے دیا۔ ۲۰۰۷ء میں آپ نے اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اس سفر میں آپ کے دوستوں اور اساتذہ نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے، آپ کے اپنے تمام اساتذہ چاہے وہ سکول کے ہوں یا کالج کے یا یونیورسٹی کے، تمام اساتذہ کے لئے آپ کے نہایت محبت اور خلوص کے جذبات ہیں۔ ایک اچھا استاد وہی ہے جو طالب علم کو تراش کر ہیرا بناتا ہے۔ آپ کو قدم قدم پر ایسے اساتذہ میسر رہے ہیں جنہوں نے آپ کی بہت اعلیٰ تشکیلِ نو کی۔

شفیق انجم کی مادری زبان پنجابی ہے، اردو اور انگریزی زبان پر بھی ان کو عبور حاصل ہے۔ اس کے علاوہ جن زبانوں پر آپ کو بنیادی حد تک دسترس حاصل ہے ان میں عربی، فارسی اور چینی زبان شامل ہے۔ معمولات زندگی برقرار رکھنے کے لئے روزگار کا ہونا نہایت اہم ہے۔ بالخصوص جب معاشی حالات ناساز ہوں ۔شفیق انجم کو بھی معاشی طور کے ضمن میں شدت سے بدحالی کا سامنا رہا۔ بالخصوص تعلیمی سفر کے دوران لیکن ان حالات سے گھبرا کر آپ نے منہ نہیں موڑا بلکہ بہتر مستقبل کے لئے کوشاں رہے اور پڑھائی کے دوران تمام اخراجات برداشت کرتے رہے اور پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے پڑھائی کے ساتھ ساتھ مختلف کام کر کے گزر بسر کرتے رہے۔

آپ کی باقاعدہ ملازمت کا آغاز بحیثیت استاد ہوتا ہے۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز جہاں سے آپ نے ایم۔اے (اردو) اور پی ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کی وہیں پی ایچ ڈی کے تحقیقی کام کے دوران اپنے اساتذہ کے مشورے اور اپنی محنت اور کاوش کی بدولت ۲۰۰۶ء میں بحیثیت لیکچرار ایک سال تک کنٹریکٹ پر پڑھاتے رہے۔ پھر ایک سال کے بعد ۲۰۰۷ء میں آپ کو سترہویں گریڈ میں مستقل لیکچرار تعینات کیا گیا جو چند ماہ بعد اٹھارویں گریڈ میں اپ ڈیٹ ہوا۔ ۲۰۱۱ء میں انیسویں گریڈ میں ترقی ہوئی اور تب سے ۲۰۱۲ء تک اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز میں تعلیمی خدمات سر انجام دے رہے ہیں

۔۲۰۱۱ء سے ہی ایم۔فل، پی ایچ ڈی کے کو آرڈینیٹر بھی ہیں۔ہائیر ایجوکیشن کمیشن سے منظور شدہ نگران ہیں اور اب تک تقریباً آٹھ (۸) پی ایچ ڈی اور دس (۱۰) ایم۔فل کے تحقیقی مقالوں پر کام کروانے کے ساتھ ساتھ پچیس (۲۵) سے زائد مقالے Evaluate کر چکے ہیں۔

۲۰۱۱ء۔۲۰۱۲ء میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز کے ہائر ایجوکیشن کمیشن سے منظور شدہ جنرل ''دریافت'' اور ''تخلیقی ادب'' کے ایڈیٹر رہے۔ایچ ای سی کے منظور شدہ مجلات میں آپ کے اب تک بیس (۲۰) سے زائد ریسرچ آرٹیکلز شائع ہو چکے ہیں اور دیگر ادبی مجلات میں چالیس کے قریب مضامین چھپ چکے ہیں۔

شفیق انجم نے صرف پڑھائی میں ہی اعزازات حاصل نہیں کئے بلکہ ملازمت کے دوران بھی کئی انعامات کے حق دار قرار پائے، جن میں ۲۰۱۶ء میں ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان کی جانب سے ''بیسٹ یونیورسٹی ٹیچرز ایوارڈ ۲۰۱۵ء (Best University Teacher Award)'' ملا۔۲۰۱۶ء میں آپ کو ''ریسرچ اینڈ پبلی کیشن ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔اسی طرح ۲۰۰۸ء میں آپ کو حکومتِ پاکستان کی جانب سے ''نیشنل یوتھ ایوارڈ'' ملا۔

شفیق انجم کی تعلیمی مصروفیات صرف نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز تک محدود نہیں بلکہ مختلف یونیورسٹیوں اور بورڈز تک تعلیمی خدمات سرانجام دینے کا کام پھیلا ہوا ہے مثلاً علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ''ممبر اردو کمیٹی'' اور مجلہ تعبیر کے ''ممبر ایڈوائزری بورڈ'' بھی ہیں۔ آپ میرپور یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (آزاد کشمیر) میں بورڈ آف سٹڈیز کے ممبر بھی ہیں۔ اس طرح ان کی دیگر بھی مختلف اداروں سے وابستگی قائم ہے۔

ii. ادبی احوال و آثار

آپ کے اندر ایک لکھاری کے جو چھپے ہوئے جوہر تھے وہ کسی نہ کسی شکل میں اپنا اظہار پاتے رہتے تھے گو آپ نے اس پر ابتدائے زمانۂ طالبِ علمی میں کبھی خاص توجہ نہ دی۔کالج کے زمانے میں آپ کو باقاعدہ لکھنے کا شغف پیدا ہوا۔یہ ہم ۱۹۹۷ء۔۲۰۰۰ء کے درمیانی عرصہ کی بات کر رہے ہیں۔پھر جب آپ نے ''نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد'' میں داخلہ لیا تو آپ کو ڈاکٹر رشید امجد اور پروفیسر احمد

جاوید جیسے شفیق اساتذہ کی سرپرستی اور شاگردی حاصل ہو گئی۔ انہوں نے آپ کی کانٹ چھانٹ اور تراش خراش میں کلیدی کردار ادا کیا، انہیں کی بدولت آپ افسانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے کئی افسانہ نما کہانیاں لکھیں جو اساتذہ کی طرف سے راہنمائی کے ساتھ ردّ ہوتی رہیں مگر ایک لمبے عرصے کی مشق نے آپ میں نمایاں بہتری پیدا کر دی۔ یہ ۲۰۰۷ء۔۲۰۰۸ء کا ذکر ہے جب آپ نے باقاعدہ لکھاری کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔

آپ کا پہلا افسانہ رسالہ سیپ کراچی میں ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ ۲۰۰۷ء میں ہی آپ کی تنقید کی کتاب ''جائزے'' منظر عام پر آئی جس کو خوب پذیرائی ملی۔

آپ کے قلم کا رواں ہونا آپ کی گہری لگن اور مشق کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد تخلیقات کا سلسلہ چل پڑا یہاں تک کہ ۲۰۰۸ء میں آپ کا پہلا ناول ''وجود'' شائع ہوا جس کو اہل نظر نے ہاتھوں ہاتھ لیا جبکہ آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''میں + میں'' ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آ گیا۔ اب تک آپ کی ۲۲ کتب شائع ہو چکی ہیں جو ناقدین کی طرف سے دادِ تحسین پا چکی ہیں۔

تصانیف

آپ کی تصانیف کی فہرست ذیل میں پیش ہے:

جائزے (تنقید)	۲۰۰۷ء
وجود (ناول)	۲۰۰۸ء
میں + میں (افسانے)	۲۰۰۸ء
کلام طارق (تدوین)	۲۰۰۸ء
اردو افسانہ۔ (تنقید)	۲۰۰۸ء
رشید امجد، ایک مطالعہ	۲۰۰۹ء
گوہر نوشاہی، ایک مطالعہ	۲۰۰۹ء

رشید امجد، شخصیت و فن ۲۰۱۰ء

کلام بشیر صرفی (تدوین) ۲۰۱۰ء

گلزارِ فقر (تدوین) ۲۰۱۱ء

سیر دریا (تدوین) ۲۰۱۱ء

لکھت لکھتی رہی (افسانے) ۲۰۱۱ء

اردو رسمیات مقالہ نگاری ۲۰۱۱ء

انشائے اردو (تدوین) ۲۰۱۵ء

حاشیائی مقالات ۲۰۱۵ء

قواعد تحقیق و تدوین ۲۰۱۵ء

میں نہیں ہوں (نظمیہ کہانیاں) ۲۰۱۶ء

جلاوطن خود کلامی (نظمیہ کہانیاں) ۲۰۱۷ء

سنکیانگ میں محبت (نظمیہ کہانیاں) ۲۰۱۸ء

سنکیانگ نامہ (رپورتاژ) ۲۰۱۹ء

روشنی آواز دیتی ہے (افسانے) ۲۰۲۰ء

موتیوں کی مالا (نظمیہ کہانیاں) ۲۰۲۲ء

ادبی سرگرمیوں میں اچھی اور معیاری کتب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ آپ کو فن آرٹ اور موسیقی سے بھی خاصہ لگاؤ ہے، اچھی موسیقی سننے کا بہت شوق ہے۔ پر سکون فضا، فطری مناظر اور خوبصورتی کی رچی بسی فضا میں موسیقی سننے کا شوق رکھتے ہیں اور رموزِ رقص میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اچھے

کھانے بھی پسند کرتے ہیں اور اس کی تعریف بھی کرتے ہیں، کھانے اچھے کا شوقین تو ہر شخص ہوتا ہے لیکن شفیق انجم کی خوبی یہ ہے کہ وہ اچھا کھانا پکانا بھی جانتے ہیں۔

شفیق انجم کی شخصیت نکھارنے میں ان کے اساتذہ کا اہم کردار ہے۔ شخصیت ہی انسان کی اصل پہچان ہے۔ یہ انسان کی ذات کا وہ عنصر ہے جو معاشرے میں اس کا مقام متعین کرتا ہے۔ ڈاکٹر شفیق اپنے نام کی طرح انتہائی شفیق طبیعت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنا حال اور مستقبل سنوارنے کے لئے دن رات محنت و لگن سے کام کیا۔ خود بھی محنت کرتے ہیں اور اپنے ساتھیوں، طالب علموں کو بھی محنت کا درس دیتے ہیں۔ ان کے مزاج میں نرم دلی ہے جو عام دیکھنے والے کو نظر نہیں آتی لیکن اس کا اندازہ ان سے گفتگو کر کے لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم نے تعلیم کی راہ میں بہت سی مشکلات برداشت کیں ہیں مگر اس چیز نے ان کی شخصیت نکھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آپ آج جس مقام پر ہیں اس میں آپ کے اساتذہ اور والدین کی دعائیں تو ہیں ہی مگر اس میں ایک نمایاں پہلو آپ کی اپنی کوشش اور لگن کا ہے۔ زندگی میں آنے والے مسائل کو آپ نے ایک راہبر کی حیثیت دی ہے کیونکہ حالات کیسے بھی آئیں وہ آپ کی طبیعت میں نکھار اور ٹھہراؤ لاتے ہیں۔ آپ کی کامیابیوں اور اعلیٰ مراتب کے حصول کے لیے بہت سے لوگ رطب اللسان ہیں۔

iii. زیر تحقیق افسانوی مجموعوں کا مختصر تعارف

زیر تحقیق مقالہ میں شفیق انجم کے تین افسانوی مجموعوں کے افسانوں کو تجزیاتی عمل سے گزارا گیا ہے۔ ان مجموعوں کے نام بالترتیب "میں + میں"، "لکھت لکھتی رہی" اور "روشنی آواز دیتی ہے" ہیں۔ ان افسانوں میں جبر اور تنہائی کے عناصر کو بہ طور خاص اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کی دیگر کتب پس منظری مطالعے کے طور پر پڑھی گئی ہیں جبکہ وہ تحقیق میں شامل نہیں ہیں جن میں ان کی نظمیہ کہانیاں اور ناول "وجود" شامل ہیں۔

ا۔ افسانوی مجموعہ "میں + میں" کا تعارف

شفیق انجم کی افسانوی لکھت کا آغاز ۲۰۰۷ء میں ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ ادبی رسالے "سیپ" کراچی سے ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کی افسانے مختلف رسالوں میں تواتر سے شائع ہوتے رہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ " میں + میں " اسلوب پبلشرز اسلام آباد سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ یہ کل ۲۰/ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ معروف افسانہ نگار اور نقاد ڈاکٹر رشید امجد نے تحریر کیا جبکہ دیباچہ ڈاکٹر احمد جاوید نے لکھا۔ جس میں ان کی کہانیوں کو سراہا گیا اور نوجوان لکھاری کی قلمی خصوصیات کو

اجاگر کیا گیا ہے۔ ہر دو ناقدین نے اپنی آرا میں انہیں سماجی و نفسیاتی طور پر نمائندہ افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ یہ کہانیاں معاصر زندگی سے وابستہ مسائل کی عکاس ہیں۔ شفیق انجم نے فرد کے خارج کے ساتھ داخلی کرب، جبر ،خوف اور تنہائی جیسی کیفیات کو عیاں کیا ہے۔ اس سے ان کی معاشرے پر عمیق نظری کا تاثر ملتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد "میں + میں" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "یہ کہانیاں ایک طرف تو اپنے سیاسی و سماجی منظر نامے جنم لیتی ہیں تو دوسری طرف ان کا ایک اہم مسلہ فرد کی شناخت کا بھی ہے لیکن یہ شناخت یک پہلو یا یک سطحی نہیں بلکہ نئے سائنسی نکشافات کے نتیجہ میں فرد اور کائنات کے جن رشتوں کا تصور ابھرا ہے اس کے بارے مین ایسے غور و فکر پر مشتمل ہے جس میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبہ بھی شامل ہے"۔ (۲۹)

شفیق انجم کے ہاں فرد کی شناخت کا مسلہ بہ طور خاص موضوع بنتا ہے اس مسلے کو وہ خود کلامی کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شناخت کے ساتھ ذات کی تلاش میں وہ الجھے دکھائی دیتے ہیں۔ عدم شناخت اور ذات کی تلاش کے حوالے سے ان کے افسانے "میں + میں"، منجمد لمحوں کا سفر"، "گمشدگی "وغیرہ اہم ہیں۔

ان کہانیوں کے موضوعات بھی شفیق انجم کے فکر کے عکاس ہیں، جس سے کہانی کے مرکزی خیال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے کی کہانیوں سماجی و نفسیاتی بے راروی، دم گھٹتا ماحول، جبریت، خوف اور تنہائی کی مختلف صورتوں کو عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ ان کی لکھت کا آغاز ہے جس میں سنجیدہ لکھاری کے تمام اوصاف موجود ہیں۔ اس مجموعے کا موضوع فرد کی دہرے پن کا عکاس ہے۔ جہاں انسان کے اندر ایک اور انسان موجود ہوتا ہے۔ اس مجموعے کے اسلوب کے حوالے سے دیباچہ میں ڈاکٹر احمد جاوید لکھتے ہیں:

> "شفیق انجم کو اسلوب سازی سے خصوصی دلچسپی ہے۔ اس ضمن میں وہ علامت سے کام لیتا ہے اور تمثیل سے بھی جبکہ جملہ سازی میں شعری عناصر سے کام لینا بھی ان کے مخصوص ذوق کی شناخت ہے"۔ (۳۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے شفیق انجم کے اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہے۔ ان کے افسانوں میں مختلف علامتیں مستعمل ہیں جن میں "بابا"، "دربار"، دریا"، "ماں" اور "پُل" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ واحد متکلم کا

صیغہ کہانی کی بنت میں مستعمل ہے۔ خود کلامی، خواب اور واہمے ان کہانیوں کے نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جدید افسانہ نگاری میں روایتی افسانے جیسا کہانی پن اور کرداروں کی مضبوطی شفیق انجم کے ہاں عمدگی سے پیش کی گئی ہے۔ جدید افسانہ نگاری کی روایت کو ایک نئے انداز اور تفکر کے ضمن میں یہ کہانیاں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

ب۔افسانوی مجموعہ "لکھت لکھتی رہی" کا مختصر تعارف

شفیق انجم کی افسانہ نگاری کا آغاز ۲۰۰۷ء میں ہوا۔ اس کے بعد ان کی لکھت ارتقائی مدارج سے ہوتی ہوئی دوسرے افسانوی مجموعے "لکھت لکھتی رہی" تک جا پہنچی۔ یہ افسانوی مجموعہ الفتح پبلیکیشنز راولپنڈی سے ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل ۱۶/ افسانے ہیں۔ یہ افسانے ان کے پہلے افسانوں کا تسلسل ہیں جہاں معاصر زندگی بدلتے حالات کے ساتھ مسائل سے دوچار ہے۔ فرد داخلی سطح پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ شفیق انجم کے ہاں عام آدمی کی زندگی بالخصوص موضوع بنتی ہے، سماجی سطح پر عام آدمی اور اشرافیہ میں فاصلے کو عمدگی سے پیش کرتے ہوئے طبقاتی تقسیم کے خلاف سراپا احتجاج نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے افسانے "ایک عام واقعہ"، "میں مصور نقش گر"، "دکھتی روگ کہانی" اور "ا=ی" قابلِ ذکر ہیں۔

"لکھت لکھتی رہی" کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ ان کی کہانیاں ایک وقت میں بہت سے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں جس سے فرد کی نفسیاتی کشمکش ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان کے کردار نفسیاتی سطح پر زندگی اور موت کی میں اٹکے ہوئے ہیں اور کہیں تنہا زندگی کی تاریکی کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانے "منظر خواب کا ہے" اور "دنیا دکھ ہے" اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ ان کی فکری بصیرت کا واضح ثبوت ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے یہ کہانیاں ان کی زندگی کے تجربات ہیں۔ واحد متکلم کا صیغہ ان کے ہاں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس افسانے مجموعے میں ان کی کہانیاں علامت سے سادہ بیانیے اور سادہ بیانیے سے علامت کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ کہانی جاتے جاتے کسی دوسری سمت پلٹ جاتی ہے اور آگے جا کر واپس جست لے لیتی ہے۔ یہ کہانیاں ان کی مذہبی آگہی کی بھی عمدہ مثال ہیں۔ انہوں نے افسانے "لکھت لکھتی رہی" اور "میں عصاہوں" میں قرآن مجید کی مختلف آیات کو شامل تحریر کیا ہے۔ جس سے خود شناسی کے پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اس افسانوی مجموعے کے آخر میں "مشاہیر کی آرا" شامل کی گئی ہیں جس میں اردو ادب کے نامور ادبا نے شفیق انجم کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں سماجی و نفسیاتی زندگی کا نمائندہ افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ ان مشاہیر میں ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر روش ندیم، ڈاکٹر احمد جاوید، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر شفیق احمد اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر وغیرہ شامل ہیں۔ مشاہیر کی آرا کو ڈاکٹر ظفر احمد نے ترتیب دیا ہے۔

ج۔ افسانوی مجموعہ "روشنی آواز دیتی ہے" کا مختصر تعارف

"روشنی آواز دیتی ہے" شفیق انجم کی لکھت کا تازہ مجموعہ ہے۔ یہ ۲۰۱۹ء میں الفتح پبلی کیشنز راولپنڈی سے شائع ہوا۔ اس میں کل ۹/ افسانے ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے لکھا ہے۔ یہ کہانیاں ان کے فلسفیانہ تفکر کو اجاگر کرتی ہیں۔ انہوں نے فرد کی زندگی کو سنجیدگی کو پرکھا، سمجھا اور ان کہانیوں میں قلم بند کیا ہے۔ ان افسانوں میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ فرد اور کائنات کا تعلق نئے روپ میں ان کہانیوں کا حصہ بنتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف ان کہانیوں کے موضوعاتی پہلوؤں کے ضمن میں اس کتاب کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

> "زندگی کی کہانی، انسان کی کہانی، ارتقا کی کہانی، الٹے پاؤں لوٹ جانے کی کہانی، جون کی کہانی، جون میں آنے کی کہانی، شہروں کے جنگل ین اتر جانے کی کہانی، جنگلوں کے شہروں میں بکھر جانے کی کہانی، ترقی کی کہانی اور ترقی کے نقاب میں چھپی جبر کی کہانی۔ مرد کی بات، عورت کی بات، پلاسٹک کے مرد و زن کی بات، محبت کی بات، جمال کی بات، جمال کے فراق کی بات، فراق کے جمال کی بات۔ عجیب گھمن گھیریاں ہیں"۔ (۳۱)

شفیق انجم نے اس مجموعے میں ارباب اختیار کے رویوں کی تصویر کشی، طبقاتی نظام، ماضی کی اذیت اپنے کرداروں اور مناظر سے منظر عام پر لاتے ہیں۔ فرد کی تنہا زندگی اور تنہائی کی وجہ سے جبریت زدہ ماحول کو بہ خوبی بیان کیا ہے۔ انہوں نے سادہ بیانیہ کے ساتھ علامتی و شعری بیاں کو بھی استعمال کیا ہے۔ منفرد اسلوب کو عمدگی سے پیش کرنا اک کا خاصا ہے۔ اس مجموعے کی کہانیوں کا مدار وقت کی رفتار کو زمانے میں مقید کرتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شفیق انجم کا انتساب "زمانے کے نام کہ بیت کر بھی۔۔۔ بیتتا رہتا ہے" وقت کے

مدار کو ظاہر کر رہا ہے۔ ادبی رسالے "قومی زبان" میں زیر تعارف افسانوی مجموعے پر تبصرہ شائع ہوا جس کا اقتباس درج ذیل ہے:

> "یہ زندگی کے انتہائی سنجیدہ معاملات کے وہ کرے ہیں جو ایک حساس، طبع، گہرے مشاہدے اور آگہی و آگاہی کے ایک خاص درجے حامل لکھنے والے کے قلم سے جاری ہوئے ہیں۔ ان میں ہماری سماجی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی الم ناک صورت حال کو پُراشتعال تفکر کے ساتھ سپردِ قلم کر دیا گیا ہے"۔ (۳۲)

شفیق انجم کے تینوں افسانوی مجموعے ان کی ذہنی بصیرت کے عکاس ہیں۔ ان افسانوں میں معاصر زندگی بالخصوص جدید زندگی کے نشیب و فراز کو عمدگی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے لئے مصنف نے علامت، تمثیل اور پیکر تراشی کو بہ خوبی استعمال کیا ہے۔ شفیق انجم فرد کو بھنور میں دیکھتے بھی ہیں اور انہیں باہر نکلنے کا راستہ بھی مہیا کرتے ہیں۔ روشنی زندگی کی علامت ہے جسے شفیق انجم نے موضوع بنایا ہے۔ اس کا متضاد اندھیرا ہے، زندگی مختلف زاویوں سے انسان کو اپنی طرف راغب کرتی رہتی ہے۔

حوالہ جات

1. Richard Gill & Emest Sherman (ed.), The Fabric of Existentialism Philosophical and Literary sources, Meredith Corporation, New York, 1973, p.614

2. Copleston, F.C., Existentialism and Modern Man, Black Fairer, London,1948, p.4

3. Cuddon, J.A, Dictionary of Literary Terms and Literary Theory, Penguin Books Great Britain, 1992, p.316

4. Bashir Ahmed Qureshi (ed.), Practical Dictiionary (English into Urdu), The Kitabistan Publishing Company Lahore, P.475

5. Macquarrie, John, Existentialism, Penguin Books Great Britain, 1980 p.62

6. Fallon, S.W. (ed.), English Urdu Dictionary, Urdu Science Board Lahore, 1982, p.336

۷۔ جامع اللغات، ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب لاہور، ص ۲۳۴

۸۔ سید احمد دہلوی، مولوی، (مؤلف) فرہنگِ آصفیہ، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ لاہور، ۱۹۴۷ء، ص ۶۴۶

9. Copleston, F.C., Existentialism and Modern Man, p.5

۱۰۔ ایضا، ص ۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۵

۱۲۔ جمیل اختر مجبی، ڈاکٹر، فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص-۱۶۹ ۱۶۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۸۵

۱۴۔ حیات عامر حسینی، ڈاکٹر، وجودیت، روشن پبلی کیشنز، سری نگر، ۱۹۹۰ء، ص ۵۳

15. George Novack, Existentialism versus Marxism, A Delta Book, N. Y, 1978, p. 5

۱۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۳۶۸۔۳۶۷

۱۷۔ بختیار حسین صدیقی، وجودیت، مرتبہ جاوید اقبال ندیم، پنجاب بک سنٹر، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۹

18. Collins, Dictionary of philosophy, p 140

19. Collins Dictionary of philosophy, p158

20. H.J. Blackham, Six Existentialist thinkers Routledge, London, 1961, p50

21. Jeaan Paul Sartre, Being and nothingness, Tr. By Hazel, E. Barnes, University of Colorado, Washington press, N. Y. 1966. p 559, 707

۲۲۔ غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر، وجودیت کیا ہے (مضمون)، مشمولہ ادبی دنیا، کراچی، ستمبر ۱۹۶۴ء، ص ۲۴۹

۲۳۔ نیاز عرفان، علامہ اقبال اور وجودی فلسفہ (مقالہ)، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۷۲

۲۴۔ سی اے قادر، وجودیت، مشمولہ: ادب فلسفہ اور وجودیت، مرتبہ: شیما مجید، نعیم احسن، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۸۷

۲۵۔ جاوید حسین، قاضی، وجودیت، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۱

26. Arthar c Danto, Sartre, Fontana/Collins, Great Britain, 1975, p 105

۲۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تحریری انٹرویو از شاہین مفتی، مطبوعہ ادبیات پاکستان، جنوری ۱۹۹۵ء

28. George Novack, Existentialism versus Marxism, p. 6

۲۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، (پیش لفظ) میں + میں، از شفیق انجم، اسلوب، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۷

۳۰۔ ایضاً۔ ص ۱۱

۳۱۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، (دیباچہ) روشنی آواز دیتی ہے، از شفیق انجم، الفتح پبلیکیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص ۸

باب دوم

شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

جبر یا جبریت کا انگریزی مترادف Determinism ہے۔ [1] جبر / جبریت کے لغوی معنی، زور، زبردستی، طاقت اور مجبوری کے ہیں۔ [2] اصطلاحی معنوں میں جبر سے مراد ایسا نظریہ ہے جس میں فرد با اختیار نہیں بلکہ بے اختیار ہے۔ اس کے تمام اعمال کا دارومدار کسی اور طاقت کے ہاتھ میں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی قومی اردو لغت میں جبریت کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> "(فلسفہ) جبریت (Determinism): نظریہ جبر۔ یہ نظریہ کہ جملہ موجودات وواقعات سابقہ حالات کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں اور خصوصاً یہ کہ انسان کے عمل اس کے آزاد ارادے پر منحصر نہیں، بلکہ ان کا تعین توریثی یا ماحولی اثرات کے تحت ہوتا ہے"۔ [3]

یہ انسانی فطرت میں ہے کہ وہ اشیاء کی پہچان ان کے تناظر، فرق، تضاد اور تقابل کی رو سے کرتی ہے۔ جبر کو اِس رُو سے دیکھیں تو جبر کا متضاد اختیار ہے۔ جبر، جو غلامی اور ماتحتی کا تصور رکھتا ہے اس کے برعکس اختیار، آزادی اور خود مختاری کا تصور رکھتا ہے۔ جبر کو اگر عہد کے حساب سے دیکھیں تو صنعتی اور مشینی دور کے مسائل کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس صنعتی اور مشینی دور نے جہاں انسان کو مادی وسائل مہیا کیے وہیں اسے کئی طرح کے مسائل سے دوچار بھی کر دیا۔ یہ مسائل انسانی ذات سے جڑے ہیں۔ جس میں انسان کی عدم شناخت، انسانی رشتوں کا استحصال یا شکست و ریخت اور اس سے پیدا شدہ انسانی کرب، محرومی و مایوسی، جبر و تنہائی، اجنبیت و بیگانگی، بے بسی و بے چارگی اور مجبوری، خوف اور ڈر، نیز ذہنی و جذباتی مسائل وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام مسائل نے انسانی ذات / اندرون کو بہت متاثر کیا۔ جدید افسانہ نگاروں نے ان مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ یہ موضوعات انسانی ذات کے داخلی پن سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے جدید افسانہ نگاروں کے ہاں انسانی ذات کے داخلی پہلوؤں کو موضوعِ افسانہ بنایا گیا جبکہ اُن کے ہاں خارجی / سماجی و سیاسی پس منظر ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم جدید افسانے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"پہچان کی گمشدگی کا مسلہ اس وقت جنم لیتا ہے جب چیزیں اپنے مقام سے ہٹ جائیں، گڈ مڈ ہا جائیں یا کھو جائیں۔ گمشدگی میں نہ ہونے کی بحث نہیں بلکہ بہت کچھ ہو کر کچھ نہ ہونے سے بحث ہے۔ کھوئی ہوئی صورت میں چیزیں موجود تو ہوتی ہیں لیکن اپنے محور سے ہٹ جانے کی بدولت کوئی دوسرا یا وہ خود اپنی حیثیت کا تعین نہیں کر پاتیں۔ جدید افسانے میں فرد کی گمشدگی کا معاملہ فرد کی ذات سے شروع ہوتا ہے"(۴)

شفیق انجم کے افسانوں میں بھی انسانی ذات کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والی باطنی کش مکش، داخلی ہیجان اور سماجی و نفسیاتی مسائل کے موضوعات نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جبر کا پہلو بھی اسی تناظر میں نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ وہ انسان کی آزادی کا نعرہ بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ اور جہاں کہیں انسانی آزادی میں رکاوٹ نظر آتی ہے وہاں وہ مزاحمتی رویہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ موضوعِ انسانی ان کے افسانوں کا مرکزہ ہے۔ جو جدیدیت کا بنیادی قضیہ بھی ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانوں میں انسان مرکز تصورات و موضوعات کو اہمیت حاصل ہے۔ انسانی بھلائی کے لیے وہ ہر طرح کے اخلاقی، سماجی، سیاسی نیز کسی بھی طرح کے جواز کے قائل ہیں۔ بیسویں صدی عظیم جنگوں نے انسانی بھلائی کے اس جواز کو پامال کیا۔ اور اس سے انسانی وجود کے خاتمے کا احساس پیدا ہونے لگا۔ جس سے انسان کا خارجی وعدوں اور دعووں سے اعتبار جاتا رہا اور انسان نے اپنی ذات کی جانب رجوع کرنا شروع کیا۔ انسان کی وقعت اور اہمیت کا سستا پن جب عیاں ہونے لگا تو انسان ہر طرح کے دکھ اور مصیبت میں گھِر گیا، جبر تنہائی، موت، خوف اور لایعنیت جیسے مسائل سے دوچار ہو گیا۔ جدید افسانہ نگاروں نے ان محسوسات کو اپنے افسانوں کا حصہ بنایا۔ اس حوالے سے جدید اردو افسانے میں شفیق انجم کا نام اعتبار سے لیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے شفیق انجم کی کتاب "میں + میں" کے پیش لفظ میں صفحہ نمبر ۷ پر ڈاکٹر رشید امجد واضح لکھتے ہیں کہ شفیق انجم جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں اسے ورثہ میں جدیدیت کی ایک واضح، نکھری ہوئی مضبوط روایت ملی ہے۔ اس روایت میں سیاسی سماجی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ باطنی دنیا اور اس کا پُر اسرار سرمئی دھند میں لپٹا سفر بھی ہے۔ جس کی غواصی خود شناسی کے ایک ایسے عمل سے گزرتا ہے جس کے نتیجے میں اب جدید سائنسی انکشافات کی روشنی میں ایک نئی مابعد الطبیعات کی تعبیر اور اس تعبیر کے تحت انسان کی شناخت، کُل اور جُز، کے نئے معنی دریافت کرنا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے اس مؤقف سے واضح اشارہ فرد کی شناخت کے مسئلے کی جانب ہے۔ یہی مسئلہ شفیق انجم نے اپنے افسانوں میں اجاگر کیا ہے۔ جسے مختلف حوالوں سے موضوعاتی اعتبار سے افسانوں کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس سے ان کے افسانوی شعور کا بھی احاطہ ہو جاتا ہے۔ جس کے ذریعے ان کے افسانوں میں جبریت کا تجزیاتی مطالعہ مختلف حوالوں سے کیا جائے گا۔

الف۔ شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) کے تقدیری تناظرات

روسو نے یہ کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن جہاں دیکھیں انسان کہیں نہ کہیں مجبور اور بے بس نظر آتا ہے۔ کہیں اسے سماجی پابندیوں کا سامنا ہے تو کہیں تاریخی و ثقافتی پہلو اُس کے ارتقاء میں رکاوٹ بنتا نظر آتا ہے۔ انسان اپنی آزادی کے لیے ہر طرف کوشاں نظر آتا ہے۔ بچپن سے لے کر موت تک انسان اپنی آزادی کے لیے کسی بھی جبر کے خلاف مزاحمت یا بغاوت کرتا آیا ہے۔ بعض اوقات وہ جبر کی حمایت میں مجبور نظر آتا ہے۔ ایسا اس ماحول کی وجہ سے ہے جس میں وہ زندگی گزارنے پر مجبور رہتا ہے۔ تقدیری جبر بھی اسی ماحول کا حصہ ہے خاص طور پر اس مشرقی ماحول کا۔ جہاں جزا اور سزا، نیکی اور بدی جیسے تصورات نے انسان کو اخلاقیات کا درس دے رکھا ہے۔ وہیں تقدیر اور قسمت جیسی اصطلاحات نے بھی انسانی رویوں کو متاثر کیا ہے۔ جس سے جبر و اختیار کے مابین امتیاز قائم ہوتا ہے اور اسی سے انسانی اعمال کی حدود بھی مقرر ہوتی ہیں۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں تقدیر کی جبریت کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ "فرد بے اختیار ہے۔ وہ محض قسمت کا لکھا پورا کرتا ہے"۔ (۵)

شفیق انجم نے تقدیری جبر کے اس قضیے کو اپنے افسانوں میں مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ اُن کا اولین افسانوی مجموعہ "میں + میں" کا پہلا افسانہ ہی یہی ہے۔ جس میں دونوں کردار یعنی "میں" اور "میں" اپنی شناخت کے بحران سے دوچار نظر آتے ہیں۔ شناخت کا یہ بحران کسی نہ کسی جبر کے باعث ہے۔ سماجی جبر انسان کی شناخت کو عدم شناخت میں بدلتا ہے۔ اسی طرح جب یہ بحران زیادہ گہرائی اور وسعت اختیار کرتا ہے تو انسانی ذات کے اندرون تک پھیل جاتا ہے۔ جس سے انسان اپنی ذات میں ہی تقسیم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو اُس کے اندر تضاد کا باعث بنتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے جب خارج سے انسان کے مسائل کا حل نظر نہ آئے تو وہ اپنی ذات سے اپنے باطن سے رجوع کرتا ہے۔ اور جب باطن میں بھی تضاد نظر آئے تو انسان معاملہ اپنی قسمت اور

تقدیر پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہی معاملہ "میں + میں" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جس کے آغاز میں ہی اس تقدیری جبر کے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں:

> "کشٹ کاٹتے کاٹتے صدیاں بیت گئیں، ایسی مشقتیں کہ چٹانوں پر بھی وارد ہوتیں تو انھیں قطرہ قطرہ بہالے جاتیں۔ مجھ بد نصیب کی قسمت میں تو یہ بہہ جانا بھی نہیں۔ ہمیشہ سے یہ ہوا ہے کہ خاک ذروں کی مانند ریزہ ریزہ ہوتا ہوں، قریہ قریہ روندا جاتا ہوں اور جب امید بندھ چلتی ہے کہ رہائی کی منزل قریب ہے تو پھر سے قید کا ایک نیا سلسلہ آغاز ہو جاتا ہے"۔ (۶)

شفیق انجم نے اپنی ذات کے بحران کو اجاگر کیا ہے اس سے سلسلے میں ان کے کردار "میں" اور "میں" اس عدم شناخت کو شناخت میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہر طرح کی کوشش کے باوجود وہ شناخت حاصل نہیں کر پاتے۔ یہ شناخت دراصل ان کے کردار "میں" کی آزادی کے ساتھ متصل ہے۔ جس کی امید کے باوجود قید اس کے نصیب میں لکھی ہے۔ جو جبر کی ایک صورت بن کر عدم شناخت کو پروان چڑھاتی ہے۔ مذکورہ بالا افسانے میں اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "جبر کے عفریت کے کھردرے کٹیلے ہاتھ تھکتے ہی نہیں، بس گوندھے چلے جاتے ہیں اور گاچنی مٹی کی طرح میں بل پہ بل کھاتا گندھ رہا ہوں۔ اک بت طرح گھماؤ کہ جو رکتا ہے نہ تھمتا ہے، عفریت کی بے رحم انگلیاں بھی نہیں چٹختیں اور نہ مجھ میں یہ حوصلہ آتا ہے کہ جست لگا کر ایک طرف ہو جاؤں اور سینہ تان کے اپنے مزید گندھے جانے سے انکار کر دوں۔ آہ افسوس کہ میں ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بس ایک منحنی سوچ ابھرتی ہے اور دب جاتی ہے۔ لفظ اندر ہی اندر انگڑائی لیتے ہیں اور دھت ہو جاتے ہیں۔ ہونٹ جگالی کرتے ہیں اور جم جاتے ہیں"۔ (۷)

اس قتباس سے صاف ظاہر ہے کہ افسانے کا کردار "میں" جبر کے عفریت سے دوچار ہے۔ جو اپنے حق کے لیے بولنا چاہے بھی تو نہیں بول پا رہا۔ تقدیر اور قسمت کے ہاتھوں مجبور نظر آ رہا ہے۔ کتاب "میں + میں" کے دوسرے افسانے "منجمد لمحوں کا سفر" میں بھی یہی "میں" یعنی ان کی ذات تقدیر کے ہاتھوں مجبور نظر آتی ہے۔ وہ تقدیر جو بوڑھے کے کردار میں اس کی ذات کے ساتھ منسلک ہے۔ بوڑھا ہر وقت سجدے میں

پڑا رہتا ہے۔ اس کے ارد گرد دنیا کیا سے کیا ہوتی جاتی ہے۔ کتنی تصویریں ابھرتی اور گم ہوتی جاتی ہیں۔ ہر تصویر پر خون کے چھینٹے ہیں ہر طرف آگ اور دھواں اٹھ رہا ہے۔ لیکن افسانے کا واحد متکلم کردار کمبل اوڑھے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے مجبور بیٹھا یہ سارا منظر دیکھے جا رہا اور اس کی ذات میں ایک بوڑھا شخص سجدے میں گرا ہے۔ اسے ادھڑے ہوئے لوتھڑے، سڑی ہوئی ہڈیاں اور گچھا در گچھا انتڑیوں کے ڈھیروں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اس سارے کھیل کو خود نہیں روک سکتا ہے۔ اس خونریزی کو روکنے کے لیے افسانے کا واحد متکلم اس بوڑھے کا محتاج نظر آتا ہے جو اس کے اندر اس کی ذات میں موجود ہے۔ یہاں بوڑھے کا کردار علامتی ہے۔ جو اس وحشت زدہ ماحول سے نجات دلانے پر قادر نظر آتا ہے۔ افسانے کا واحد متکلم اس بوڑھے کردار (جو تقدیر کا پیکر ہے) کا محتاج نظر آتا ہے۔

> "کھردرا کٹیلا پتھر، اک کھنکھناتا ٹھیکر، اک جما ہوا خون لوتھڑا؛ اس سارے منظر میں کہیں بھی تو موزوں نظر نہیں آتا۔ اچانک ایک طرف سے بوڑھا نمودار ہوتا ہے، میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا دائرہ در دائرہ اترتا چلا جاتا ہے۔ کمرے کا دروازہ آپ ہی آپ کھلتا اور بند ہو جاتا ہے"۔ (۸)

مذکورہ افسانے میں شفیق انجم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان لاچار ہے، مجبور ہے، وہ چاہے جتنا بھی خود کو خود مختار سمجھ لے اس کی خود مختاری کا جواز کہیں نہ کہیں پامال ضرور ہو جاتا ہے جیسا کہ اس افسانے میں خونریزی کو روک نہیں پاتا اور اسے اپنی تقدیر سمجھنے پر مجبور ہے۔ وہ تقدیر جو بوڑھے کی صورت میں اس افسانے میں موجود ہے جس کی سرگوشیوں کو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی غور سے سنتا ہے۔ حالانکہ اس کے بارے میں واحد متکلم جانتا تک نہیں۔

مذکورہ کتاب کے تیسرے افسانے "گمشدگی عنواں" میں بھی اسی قسم کی کشمکش دکھائی گئی ہے جس میں افسانے کا کردار اپنی شناخت سے محروم نظر آتا ہے۔ وحشت زدہ ماحول نے انسان سے اُس کی شناخت چھین لی ہے۔ اور وہ اپنے ہونے اور نہ ہونے کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اُس کے کے ارد گرد کے لوگ جن سے اُس کا برسوں کا تعلق تھا نہ جانے وہ کدھر گئے ہیں وہ بے یقینی کے عالم میں ہے کہ وہ شاید وہ اُس سے آگے نکل گئے ہیں یا پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس پورے افسانے میں منزل پر پہنچنے کا شائبہ ابھرتا ہے۔ آگے والے آگے چلے گئے ہیں اور پیچھے والے پیچھے رہ گئے ہیں جب کہ افسانے کا مرکزی کردار ان دونوں کے درمیان ہے جو عدم شناخت

اور عدم یقین کا شائبہ ابھار رہا ہے۔ وہ رُک کر پیچھے والوں سے مل سکتا ہے نہ بھاگ کر آگے والوں سے مل سکتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں اُسے خود کے ہونے اور نہ ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ وہ طے نہیں کر پاتا کہ آیا وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ وہ اس دنیا میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ وجود کا یہ معاملہ اس کے بس میں ہی نہیں لگتا۔ وہی وجود جو اپنے دائیں بائیں کی شناخت سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کی دی ہوئی شناخت کا محتاج ہے۔ صدیوں سے یہی معاملہ چلا آرہا ہے۔ صدیوں سے چلے آرہے اس تقدیری چکر میں وہ خود کچھ کرنے یا دائروں سے باہر نکلنے سے قاصر نظر آتا ہے۔

> "صدیوں پھیلی دھند اور فاصلوں کا غبار ہمیں اپنے حصار میں پوری طرح جکڑے ہوئے ہے اور خوب خوب کوشش کے باوجود بھی ہم اس سے باہر نہیں نکل پاتے۔ میری پہچان۔۔۔ میری پہچان تو دائیں بائیں والوں سے وابستہ ہے۔ ان کے ساتھ تو میں ہوں۔ نہیں ہوں تو نہیں ہوں۔"(۹)

اس افسانے کا کردار نفی اثبات کے بھنور میں پھنسا نظر آتا ہے۔ اُسے اپنے وجود کے ہونے اور نہ ہونے کا یقین نہیں آرہا اس لیے وہ اپنے وجود کا ایک ایک عضو چھو کر دیکھتا ہے۔ اس کے وجود کے سارے حصے اس کے ساتھ متصل ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی سلامتی کا یقین کرنے سے قاصر ہے۔ اس افسانے کا وحشت زدہ ماحول دراصل سماج میں ہونے والی خونریزی کا عکس ہے۔ جس میں اس افسانے کے مرکزی کردار کو اپنی سلامتی محض تمنا اور خواب لگتی ہے۔ یوں افسانے کے اختتام تک خواب اور حقیقت کے مابین کشمکش رہتی ہے۔ حقیقت تک پہنچنا کردار کے بس میں ہی نہیں وہ اس کشمکش میں رہنے پر مجبور ہے۔ جسے نہ پیچھے والوں کی خبر ہے اور نہ آگے والوں کی خبر۔ اس لیے وہ زندگی کو ایسے ہی گزارنے پر مجبور ہے۔ تقدیر اسے کہاں لے جائے اس کا کچھ پتہ نہیں۔ جیسا کہ افسانے کی اختتامی سطروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

> "رات ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف سفر کر رہی ہے۔
>
> میرے اضطراب سے بے نیاز۔
>
> سرک رہی ہے، مسلسل سرک رہی ہے۔
>
> آدھی بیت چکی۔۔۔۔ آگے کی خبر نہیں۔"(۱۰)

کتاب "میں + میں" کے افسانے "دھند مسافت" میں بھی تقدیری جبر کے اسی رویے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جس میں زندگی ایک سیدھی لکیر میں آگے آگے بڑھتی جارہی ہے۔ افسانے کا کردار سوچ بچار سے اپنی کم مایہ زندگی کو ایک اچھے رُخ پر موڑنا چاہتا ہے لیکن وہ سو جتن کے باوجود نہیں موڑ پاتا۔ کئی ارادے باندھتا ہے، خوب سوچ بچار کرتا ہے، ہر پہلو پر گھنٹوں مغزماری کرتا ہے اور زندگی گزارنے کا ایک لائحہ عمل تیار کرتا ہے لیکن اگلی ہی صبح اس کی سوچ کے برعکس کورے کاغذ کی طرح وہ لائحہ عمل بکھر کر رہ جاتا ہے جب زندگی میں قسمت کو کچھ اور ہی منظور ہوتا ہے۔ وہ روز رات کو زندگی کی اس سیدھی لکیر کو موڑنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس کی کوشش بے سود رہتی ہے۔ افسانے میں کردار کو ایک گول ڈبے میں لڑھکتا ہوا گھومتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہے کہ زندگی کا یہ گھماؤ اپنے طور پر بڑھتا چلا جاتا ہے اسے روکنا چاہیں بھی تو نہیں روکا جاسکتا۔ وہ قسمت کی لکیروں کو اپنے طور پر درست نہیں کر پاتا اپنی خواہش کے مطابق انہیں موڑنا چاہے بھی تو نہیں موڑ سکتا۔ زندگی کا یہ جبر ایک طرف موت کے جبر کو توڑنا بھی اس کے بس میں نہیں۔ مذکورہ افسانے سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "گھماؤ میں وہ کچھ بھی تو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ بس لہریں ہی لہریں تھیں، نقطے ہی نقطے اور لکیریں ہی لکیریں۔ آنے والے کل کی لکیریں، گزرے ہوئے کل اور اس سے پہلے و بعد کے بہت سے کل۔۔۔۔ کہ جن کے سارے منظر مسلسل بل کھاتی لکیروں میں ڈھل رہے تھے۔ جلتی بجھتی تڑمڑ ہوتی لکیریں۔۔۔ نقطے اور لائنیں۔۔۔ کون دیکھے، کون جانے، کون بوجھے، کہ جاننے اور بوجھنے کا کوئی تعلق نہ تو دیکھنے سے ہے نہ سوچنے سے۔ یہ دانہ تو آپ ہی آپ بنتا ہے، آپ ہی آپ اگتا ہے اور جب جوان ہو کر لہلہانے لگتا ہے تو آپ ہی آپ کٹ جاتا ہے۔"(۱۱)

افسانے کا کردار بند ڈبے میں مسلسل لڑھکتا جارہا ہے۔ زندگی اسے جس اور لے کر جارہی ہے اسے اس کی خبر ہی نہیں۔ نہ وہ اس پر قادر ہے کہ وہ اسے اپنی خواہش کے مطابق کہیں موڑ کر لے جائے۔ زندگی کے اس ڈبے کو اپنی خواہش کے مطابق موڑنے کے لیے کئی ارادے بناتا ہے لیکن یہ زندگی کی ایک سیدھی مستقیم لکیر پر لڑھکتا جاتا ہے۔ وہ اسے کہیں بھی موڑنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ وہ تقدیر کے جبر سے چھٹکارا نہیں پا

سکتا۔ اور بالآخر اسی پر مطمئن ہونا اس کی مجبوری بن جاتی ہے۔ اور اس کی زندگی کا کاغذ ہمیشہ کورا رہتا ہے جس پر اس کی خواہشات کی لکیروں کا وجود نا ممکن ہے۔ افسانے کا اختتام ملاحظہ کیجیے:

> "مدتوں سیدھی چلتی لائن کا مڑنا کاغذ کو بھی گوارا نہ تھا۔ شاید لکیروں اور لائنوں کے کھُلنے اور نہ کھُلنے کا کوئی تعلق نہ تو مڑنے سے ہے نہ الجھنے سے اور نہ سیدھا چلنے سے۔ کچھ تو ایسی ہوتی ہیں کہ الجھ الجھ کر، مڑ مڑ کر، رگڑیں کھا کھا کے بھی نہیں کھلتیں اور کچھ ایسی کہ بن الجھے، بن مڑے آپ ہی آپ کھل جاتی ہیں"۔ (۱۲)

تقدیری جبر کے نقوش ان کی دوسری کتاب "لکھت لکھتی رہی" کے مختلف افسانوں میں جزوی یا مجموعی طور پر عیاں ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا پہلا افسانہ "لکھت لکتی رہی" میں زندگی کے المیے کو بیان کیا گیا ہے جس میں زندگی اور موت کے فلسفے کے ساتھ ساتھ، تصورِ وقت، تقدیر اور تصورِ زمان و مکاں کا فلسفہ ملتا ہے۔ تقدیری جبر کے حوالے سے دیکھیں تو یہ اافسانہ جس سطر سے شروع ہوتا ہے اسی سطر پر اس کا اختتام بھی ہوتا ہے۔ مثلاً دیکھیے:

> "میں نے اپنے آپ کو اس کنویں میں گرا دیا ہے جہاں مقید رہ جانے والی مچھلیاں مری پڑی ہیں۔" (۱۳)

بظاہر دیکھا جائے تو اس کی جملے میں زندگی اور موت کا فلسفہ نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن ایک پہلو سے وہ جبر بھی نظر آتا ہے جس نے اس کنویں میں کردار کو گرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یعنی سے موت کی جانب سفر ایک خودکار عمل کے تحت مسلسل ہو رہا ہے اس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ یہی تقدیر کا جبر ہے۔ افسانے کا اختتام بھی اسی سطر پر ہوتا ہے کہ "میں نے اپنے آپ کو اس کنویں میں گرا دیا دیا ہے جہاں مقید رہ جانے والی مچھلیاں مری پڑی تھیں"۔ (۱۴)

اگر غور کریں تو دونوں سطروں میں زمانے کا فرق ہے ابتدائی سطر زمانۂ حال کی ہے جبکہ دوسری سطر زمانۂ ماضی کی ہے۔ اس سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ زندگی سے موت کے سفر تک انسان کا کوئی اختیار نہیں اور وہ مسلسل اس کنویں میں گرتا چلا جا رہا ہے وہ مجبور ہے۔ تقدیر اسے کوئی بھی موقع اپنی خواہش کے مطابق

زندگی گزارنے کا فراہم نہیں کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کا مرکزی کردار اپنے ہمزاد سے زندگی کے اس کٹھن سفر کی داستان لکھنے کی التجا کرتا نظر آتا ہے۔

"لکھ اے میرے ہمزاد کہ یہ سفر افسوس کی ایک طویل داستاں۔

آ میرے جیتے مرتے جرثوموں پر بیٹھ ماتم کر اور لکھ کہ یہ سفر اِک بے شناخت سفر۔

آ میرے ریزہ ریزہ وجود پر سینہ پیٹ اور لکھ کہ لایعنی سفر کی اذیت سہل نہیں۔ جی چاہتا ہے زمیں پھٹ جائے اور میں چپ چاپ اس مین دھنس جاؤں، مگر یہ نہیں پھٹتی۔

آسماں مجھے نگل لینے پر مائل نہیں۔

اور رات، گھپ اندھیری رات مجھے اپنی بکل سے دور رکھے ہوئے ہے۔ یا مظہر العجائب! یہ سب کیا؟ تُو ہے، یقیناً ہے،۔۔۔۔ تیرے ہوتے ہوئے یہ سب کیوں؟"(۱۵)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ افسانے کا کردار مجبور ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے وہ گھبرا چکا ہے۔ اس سے نجات پانے کے لیے خدا سے رجوع کر رہا ہے۔ یوں تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہے۔ جسے خدا کے سوا کوئی نہیں بدل سکتا۔

درج بالا مباحث میں شفیق انجم کے چنیدہ افسانوں میں تقدیر جبر کی مختلف صورتحال اجاگر کی گئی ہے۔ ان کی افسانوں میں مختلف انداز میں جزوی یا مجموعی صورت میں تقدیری جبر کی صورتحال نظر آتی ہے۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "لکھت لکھتی رہی" کے بیشتر افسانوں میں یہ صورتحال جزوی یا مجموعی طور پر سامنے آتی ہے۔ مذکورہ کتاب کا افسانوں "زنجیرِ زندگی" اور "میں عصا ہوں" میں تقدیری جبر کی جزوی صورتحال نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب "روشنی آواز دیتی ہے" میں اس عنوان کے ساتھ پہلے افسانے کے آغاز میں ہی زندگی اور موت پر تقدیری جبر کے عناصر نمایاں ہوتے ہیں:

"منظر دیکھتے ہی دیکھتے صحرا بن گیا۔۔۔ یا شاید صحرا جیسا۔۔۔ دُور دُور تک بس ریت ہی ریت ہت، اور راکھ۔۔۔ اور دھول اور دھواں۔۔۔ فضا ویران، اداس، بپھری ہوئی۔۔۔ شُوکتی ہوئی۔۔۔

موت زندگی کو ہڑپ کر چکی ہے۔

سب کچھ اتنا غیر متوقع اور اتنی تیزی کے ساتھ ہوا ہے کہ کسی کو اپنی جگہ سے ہلنے کی بھی مہلت نہ ملی۔"(۱۶)

شفیق انجم کے افسانوں میں عام طور پر تقدیری جبر زندگی اور موت کی کشمکش میں نظر آتا ہے۔ جس میں انسان خود کو مکمل طور پر بے بس پاتا ہے۔ ان کے افسانوں کے مطابق تقدیر انسان کے سر پر تلوار کی طرح لٹک رہی ہے۔ جو کبھی بھی کسی بھی وقت پانسا پلٹ سکتی ہے۔ اس ذیل میں حیات و ممات ان کے ہاں اہم موضوعات ہیں۔ تقدیری جبر نے انسان کو جس نفسیاتی ہیجان میں مبتلا کیا ان کی عکاسی بھی خوب کی گئی ہے۔ جو ان کے ہر دوسرے کردار میں نظر آتی ہے۔ ان افسانوں میں جبریت سے نمایاں آزادی کا تصور سارتر کے تصورِ آزادی ے مماثل نظر آتا ہے۔ سی۔ اے۔ قادر سارتر کے تصورِ آزادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اگر سارتر کی طرح جملہ نفسی کوائف کو آزاد مان لیا جائے تو آزادی کا مفہوم مٹ جاتا ہے۔۔۔ سارتر کی آزادی کا تصور انوکھا ہے۔ عام طور پر یہ ذمہ داری کا تعلق سوسائٹی، خدا یا نصب العینی ذات کا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے انسا ہر شے کا ذمہ دار ہے اندرونی حوادث کا بھی اور بیرونی حوادث کا بھی، خواہ یہ حادثات اس کی مرضی سے ظہور پذیر ہوں یا نہ، ظاہر ہے کہ یہ پوزیشن خطرے سے خالی نہیں"۔(۱۷)

ذیل میں ان کے افسانوں میں نفسیاتی جبریت پر بات کی جا رہی ہے۔

ب۔ شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) کے نفسیاتی تناظرات

شفیق انجم فرد کے خارج کے ساتھ داخل کو بھی اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں جہاں فرد نفسیاتی و ہیجانی کیفیات سے دوچار ہے۔ شعور اور لاشعور کی گڈمڈ نے فرد کو ذہنی کشمکش اور دباؤ میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ نفسیاتی دباؤ ان کے کرداروں میں مختلف روپ میں نظر آتا ہے۔ نفسیاتی جبریت کے ضمن میں 'کشاف تنقیدی اصطلاحات' میں یوں تعریف کی گئی ہے:

"نفسیاتی جبریت:لاشعوری عوامل انسان کی زندگی پر حکمرانی کرتے ہیں۔ فرد ان کے ہاتھوں ایک کھلونا ہے۔نفسیات کا دعوٰی ہے کہ شخصیت کی بنیاد بچپن ہی میں پہلے پانچ سال میں پڑھ جاتی ہے۔یہ بھی جبریت ہے"۔(۱۸)

شفیق انجم کے افسانوی کرداروں میں زندگی اور موت کی کشمکش سے ان میں ذہنی ہیجان بھی نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔ زندگی کی وحشت ناکیوں اور ہولناکیوں میں گھرا انسان جب اپنی شناخت کے لیے در در مارا پھرتا ہے تو اس سفر میں وہ زندگی اور موت کے ہاتھوں بار بار اچھالا جاتا ہے۔ زندگی کے ماحول کو وحشت زدہ کرنے والے عناصر کو شفیق انجم نے اپنے افسانوں میں عمدہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ زندگی جسے موت نگلتی ہے۔اور موت بھی ایسی کہ وحشت ناکیاں چھوڑ جاتی ہے۔ جس نے سماج پر گہرا اثر ڈالا۔ جنگوں اور قتل وغارت سے مرتا انسان شفیق انجم کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔ جس کی شناخت کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ اور اب وہ عدم شناخت کے ساتھ زندگی کی ٹھوکریں اور تھپیڑے کھاتا ہوا مسلسل موت کے منہ میں جا گرتا ہے۔شناخت کا یہ بحران اتنا گہرا ہوتا چلا جاتا ہے کہ ان کے افسانوی کرداروں کی نفسیات متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں پاتی۔ جس سے وہ اپنی ذات میں خود تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی ذات تقسیم ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر افسانوں میں "میں + میں"، اور "میں اور وہ" جیسی تقسیم کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اُن کے افسانوں میں "میں" کی شناخت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جبکہ "میں" مسلسل عدم شناخت سے متصف رہتا ہے۔ "میں" کی عدم شناخت ہی اس کی ذات میں ہیجان پیدا کرتی ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم کی کتاب "میں + میں" کے افسانے بعنوان "دیمک کھنڈر آس" میں اسی قسم کی نفسیاتی کشمکش کا اظہار یہ ملتا ہے۔ جس میں زندگی کی ابتدا سے لے کر بڑھاپے تک کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ جس میں زندگی دیمک زدہ ہے اور ایک کھنڈر کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔ زندگی جس کے ہر پہلو میں ویرانی گھر کر گئی ہے۔ اداسیوں اور تنہائیوں کا بسیرا ہے۔ افسانے کی اس صورتحال نے مرکزی کردار میں نفسیاتی کشمکش پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف وہ زندگی کی رونقوں اور خوشیوں کی آس لگائے ہے تو دوسری طرف اس کی اپنی زندگی کھنڈر ہے جس میں دیمک ایسا لگا ہے کہ اب تنہائی اور اداسی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ یہ نفسیاتی کشمکش افسانے کے آغاز میں ہی نظر آتی ہے۔

"اُداسی پھن پھیلائے چاروں اور گھوم رہی ہے۔ گہرے سناٹوں میں پھنکارتی پژمردہ چاپ، لرزتے سائے اور مسلسل مدھم ہوتے کچھ بوسیدہ نقش۔ دروازے بند ہیں،

بالکل بند، اور اندر شاید کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔ باہر گلی بھی سنسان ہے اور بارش ایسی تیز کہ گویا آج سب کچھ بہالے جائے گی۔"(۱۹)

زندگی کے ہکلاپے میں انسان ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی ہکلاپا اور اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش اس افسانے کا موضوع ہے۔ اس افسانے کا کردار زندگی کے کھنڈر میں رہ کر ایک مکمل تنہائی اور اداسی کا شکار ہے، جس کی زندگی دیمک زدہ ہے۔ دیمک اس کی زندگی کو کھنڈر بناتا جارہا ہے۔ اس کے باوجود ایک آس امید بھی ہے۔ زندگی کے روشن پن کو دیکھنے کی آس۔ امید اور ناامیدی کی اس کشمکش نے بھی اس کردار کو نفسیاتی حد تک وسعت دے دی ہے۔

"کھنڈر میں کچھ سائے لرزاں ہیں، کچھ بوسیدہ نقش اور کوئی پھنکارتی ہوئی پژمردہ چاپ۔ اداسی اندھیروں کے ساتھ قدم قدم رینگتی در ودیوار میں گھسی چلی جارہی ہے اور میں۔۔۔۔ اور میں کہ جو انہی دیواروں کے بیچوں بیچ کہیں دفن ہوں، دینک زدہ آنکھوں میں گلاب سجائے دور گلی کے نکڑ پر ٹمٹماتے چراغ کو تکے چلا جارہا ہوں۔ شاید کوئی چلا آئے۔ کوئی نقرئی کھنکھناہٹ، کوئی نشیلی ترنگ۔۔۔۔ لبالب بھری زندگی۔ مدتیں ہوئی اُسے گئے ہوئے۔ کاش وہ لوٹ آئے۔"(۲۰)

اسی طرح کی نفسیاتی کشمکش مذکورہ بالا کتاب کے افسانے "تھک کر گرتے شوخ پرندے" میں بھی نظر آتی ہے۔ جس میں کسی لڑکی کا مرکزی کردار کے گھر آنا۔ مرکزی کردار اور اس کی ماں کا اُس لڑکی سے متاثر ہونا۔ پھر لڑکی کا واپس چلے جانا۔ مرکزی کردار کا اُس کے خوابوں خیالوں میں رہنا۔ یہ سب صورتحال ایک نفسیاتی کشمکش کو اجاگر کرتی ہے۔ مرکزی کردار اُس لڑکی کو آسمان کا نور سمجھتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس وہ خود کو وحشت زدہ سمجھتا ہے۔ نفسیاتی کشمکش اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لڑکا اس سے محبت کے باوجود اظہار نہیں کر پاتا اور اس سے دور بھاگنے لگتا ہے۔ وہ اُسے تخت پر بیٹھی ہوئی کوئی حُور سمجھتا ہے جو آسمان میں اڑتا چلا جارہا ہے۔ جسے ہوا کا بہاؤ بہائے جارہا ہے۔ جبکہ لڑکا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر ہوا کے اس دباؤ کو روکنا چاہتا ہے لیکن ہوا اس قدر شدید ہوتی ہے کہ اس کا سینہ چیرتے ہوئے تخت کو بہالے جاتا ہے۔ لڑکے کا یہ خواب / خیال اسے نفسیاتی جبر کا شکار کرتا نظر آتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"تخت مسلسل اڑا چلا جاتا ہے لیکن زمین کا کھردرا سا احساس برابر موجود ہے۔ یہاں منظروں میں دھندلاہٹ اور اندھیرا غالب ہے۔ جھکڑ، آندھیاں اور وحشت و خوف سے بھری سنسناہٹیں ہیں۔ میں ایک چٹانی پہاڑ پر کھڑا ہواؤں کے سامنے سینہ سپر ہوں۔ بدن جگہ جگہ سے پھٹ چکا ہے اور خونی جھکڑ میرے سینے میں سے سوراخ کرتے ہوئے نکل جانا چاہتے ہیں۔ تخت کا بہاؤ پُر سکون ہے اور میں چیخ چیخ کر اسے دور بہت دور نکل جانے کا کہہ رہا ہوں، لیکن بے سود۔ میری چیخوں کے مقابلے میں ہواؤں کے زناٹے زیادہ پُر شور ہیں۔ اچانک ایک تُند لہر یا اسے لپیٹتا ہوا بھنور یلے دائروں میں کھینچ لاتا ہے اور پھر سب تختہ تختہ ہو جاتا ہے۔ میرا جسم بھی کسی منہ زور تھپیڑے کے ہاتھوں لوتھڑا ہو کر کہیں کا کہیں بکھر جاتا ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ بس ایک بے رحم گھماؤ کا احساس اور مسلسل ادھڑتے لوتھروں کی اذیت۔ یہ خواب سا میرے ذہن میں اکثر چابک مارتا دندناتا رہتا۔"(۱۲)

اسی طرح کی ایک نفسیاتی کشمکش مذکورہ کتاب کے ایک افسانے "جاڑوں میں کِھلا خواب" میں نظر آتی ہے۔ جس میں افسانے کا مرکزی کردار بابے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے لیکن اسے بابا نہیں ملتا۔ وہ اپنے استاد سے مشورہ طلب کرتا ہے۔ استاد اسے صوفیانہ انداز میں سمجھاتا ہے۔ زمینوں میں گھوم گھوم تلاش کرنے کا مشورہ ملتا ہے۔ مرکزی کردار پر بابے سے ملنے کا ایک نفسیاتی جبر نظر آتا ہے۔ اسی جبر کے تحت وہ دائروں میں گھومتا پھرتا رہا۔ صوفیوں اور درویشوں کا طریق اپناتا ہوا برس ہا برس بابے کی تلاش جاری رکھی۔ اپنی ذات کی شناخت کا معاملہ اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ اس کٹھن راستے سے واپس مڑنا اُس کے لیے محال ہو جاتا ہے۔ خود پر جبر کی یہ صورتحال نفسیاتی حد تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

"۔۔۔ وہ عبارت حذف کر دوں تو اچھا کہ جس کا اس کہانی میں دخول ذہنوں میں درد بن کر کلبلانے لگے۔ آوارگی کے برس ہا برس کہ جو میں نے قدم قدم جبر کی سیخوں پر چھدتے اور لمحہ لمحہ ہلکان ہوتے گزار دیئے۔ دائروں میں گھوم گھوم اپنے آپ کو دھند وادیوں میں اتنا دور تک اس بے دردی سے اچھال دیا کہ واپسی کا سفر وہم لگنے لگا۔ خالی کھوپڑیوں اور ادھڑی ہوئی انتڑیوں کی مصاحبت۔۔۔ فقط اس لیے کہ کچی مٹی جب تک تند تھپیڑوں کے ساتھ گوندھی نہ جائے ٹھیکر نہیں بنتی۔ لکھوں تو فقط چیخ چیخ اٹھیں،

بولوں تو زبان کڑ کڑا جائے۔ سو بہتر ہے کہ اندھی یادوں کا حرف حرف بن لکھا، بن کہا
ہی رہے۔ بے خبر ساعتوں کی ہوا چلے تو کیا، نہ چلے تو کیا۔"(۲۲)

اس افسانے میں بابے کی تلاش کا نفسیاتی جبر اس کے ملنے کے بعد ٹوٹ جاتا ہے۔ اس طرح کا نفسیاتی جبر مذکورہ کتاب کے افسانے "بِن لفظوں کے کہا سنا" میں بھی نظر آتا ہے۔ جب لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے پر فریفتہ ہوتے نظر آتے ہیں۔ دونوں خوابوں کی رنگینی اور محبت کی خوشبوؤں میں معطر ہوتے نظر آتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ پہلے پہلے اس اجنبی کیفیت سے جان چھڑانے کے لیے لڑکا میاں جی اور لڑکی دادی جان کے ٹوٹکوں پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن محبت کا گھوڑا بھلا کیسے رک سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ ایک طرح کا نفسیاتی جبر کا باعث ہو گا۔ جیسا کہ اس افسانے میں بھی نظر آتا ہے کہ لڑکا لڑکی دونوں ایک دوسرے سے آنکھیں چار کرنے کے بعد فاصلہ رکھنے کی خواہش کرتے ہیں لیکن بالآخر انہیں محبت کے بے لگام گھوڑے کے مقابل ہارنا پڑتا ہے۔ اسی طرح کا نفسیاتی جبر اس کتاب کے افسانے "اُکڑوں بیٹھا وقت" میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ شفیق انجم کا دوسرا افسانوی مجموعہ "لکھت لکھتی رہی" میں شامل ایک افسانہ بعنوان "منظر خواب کا سا ہے" مکمل طور پر ایک نفسیاتی اافسانہ ہے۔ جس کے مرکزی کردار میں زندگی اور موت کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ جو عدم شناخت کا پیکر معلوم ہوتا ہے۔ عدم شناخت نے اسے ایک نفسیاتی ہیجان کا شکار کر دیا ہے۔ وہ زندگی کا استعارہ ہے لیکن موت سے مکالمہ کرتا ہے۔ اپنی شناخت کے لیے موت کا سہارا لیتا ہے۔ اور اس سے استدعا کرتا ہے کہ اسے ماضی کے جھروکوں میں لے جائے جہاں اس کے تاریخی حوالے اُسے شناخت دیں گے اور اُس کے ہونے کا اثبات کریں گے۔ زندگی اور موت کے مکالمے میں ایک ایسی نفسیاتی کشمکش دکھائی گئی ہے جو جبر کی صورت میں اس کردار کے اندرون میں پیوست ہے۔ اس کی زندگی اس قدر وحشت ناک ہے کہ وہ روز موت سے مکالمہ کرتا ہے۔ وہ خود کی پہچان چاہتا ہے۔ اور اس پہچان اور شناخت کی پیروی کرتے ہوئے موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ اس نفسیاتی جبر کا اظہار یہ اس افسانے کے ایک اقتباس سے ملاحظہ کیجیے:

"ہڈیوں میں گھس جانے والا غم مجھے دبوچ رہا ہے۔۔۔ بے طرح دبوچ رہا ہے۔

آہ افسوس کہ میرا ہونا نہ ہونا ایک ہے۔

میں۔۔۔

اک مٹھی بھر مٹی۔۔۔ اک بے ڈھب لوتھڑا۔۔۔ اک چپکتی ہوئی غلاظت کہ جو بہتے جم گئی ہے۔

نہ جاننا اک عذاب ہے۔ اور جان لینا اس سے بھی بڑا عذاب۔

تف ہے مجھ پر اور میرے ہونے نہ ہونے پر۔

بے اختیار میں موت کی طرف متوجہ اور گڑگڑایا، "میں مرنا چاہتا ہوں۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرنا چاہتا ہوں۔"(۲۳)

اس افسانے میں آغاز سے لے کر اختتام تک اسی طرح کی نفسیاتی کیفیات کا اظہار ملتا ہے۔ اور افسانے کا کردار جب موت سے استدعا کرتا ہے کہ اسے مرنے سے پہلے ماضی کی تاریخ میں واپس لے جائے تاکہ وہ خود کی شناخت کر سکے۔ ماضی کے واقعات کو یاد کر سکے۔ تو موت اسے تاریخ میں واپس اس کے بچپن میں لے آتی ہے وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھتا ہے اس کا بچپن اس قدر دردناک ہوتا ہے کہ وہ اسے دیکھ نہیں پاتا۔ اور موت کو پکارتا ہے۔ افسانے کے آخر میں لوگوں کو دریا کے کنارے اُس کے جوتے ملتے ہیں۔ وہ اپنی شناخت کے نفسیاتی جبر کے ساتھ موت کو گلے لگا چکا ہوتا ہے۔ دراصل انسان اپنی زندگی کے جبر سے آزادی کا ہمیشہ خواہش مند رہا ہے۔ چاہے وہ آزادی اسے موت کی صورت میں ملے یا پھر کسی بغاوت یا مزاحمت کے نتیجے میں حاصل ہو۔ دراصل انسان اپنی شخصیت اپنے تشخص اور اپنی شناخت کی تکمیل چاہتا ہے۔ بقول محمد جلیل الرحمان:

"شخصیت کی تکمیل کے لیے انسان نے کئی مدارج وضع کیے جس کے پس منظر میں چاہے جانے کا اصول کار فرما ہے وجودی حکما کے نزدیک وجود مستند انسانیت کی معراج ہے"۔(۲۴)

جلیل الرحمان کی بات کا اثبات شفیق انجم کے افسانوں سے ہوتا ہے۔ جس میں ہر کردار اپنے وجود کا اثبات چاہتا ہے۔ اور چاہے جانے کا تاثر قائم کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کے کردار نفسیاتی جبر کا حامل ہیں۔ یہ نفسیاتی جبر مذکورہ کتاب کے ایک افسانے "دنیا دکھ ہے" میں بھی نظر آتا ہے۔ جس نے فضل دین مزارع کے بیٹے کو ایک نفسیاتی ہیجان میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ نفسیاتی ہیجان اس طبقاتی کشمکش کی وجہ سے ہے جس نے گاؤں

کے وڈیروں اور مزارع کے مابین ایک امتیاز قائم کر رکھا ہے۔ یہ امتیاز مالک اور نوکر کا ہے۔ پورے افسانے میں اسی کشمکش نے فضل دین مزارع کے بیٹے کو نفسیاتی طور پر متاثر کر رکھا ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اس نے دکھ ہی دکھ جھیلے ہیں۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اس کے والدین نے اسے جو سمجھایا وہ اپنے ذہن کے پنوں پر لکھتا رہا۔ وہ عہد و پیمان جو مزارع ہونے کے ناطے اسے دیئے گئے تھے وہ لکھتا رہا اور اُن پر کاربند تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مزارع کا بیٹا بڑے بڑے خواب نہیں دیکھ سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کھیتوں سے باہر کوئی نئی امید کی کرن نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں تو بس اپنے شب و روز زندگی کمانے کا موقع چاہیے۔ فضل دین مزارع کا بیٹا اپنے باپ کے ساتھ زمینوں سے چارہ لاتا۔ مویشیوں کو پانی پلاتا۔ ہل جوتتا۔ کھرپے درانتی سے باغ کی گوڈی کرتا۔ دن کو کریانے کی چھوٹی سی دکان پر دکانداری کرتا۔ شام کو باہر گلی میں پکوڑے سموسوں کی ریڑھی لگاتا۔ رات گئے درزی کی دکان پر بیٹھ کر سلائی سیکھتا۔ یہ فضل دین مزارع کا بیٹا تھا۔ جس نے دنیا کو بہت کم عمری میں قریب سے پہچان لیا تھا۔ مزارع ہونے کے ناطے اسے اندازہ تھا کہ وہ کوئی بڑی خواہش نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود کہ وہ پڑھ لکھ گیا تھا اس کے ماں باپ نے اسے سکول کالج اور یونیورسٹی تک کی تعلیم دلا دی لیکن اس کی پہچان مزارع پھر بھی نہیں بدلی۔ یہ پہچان نفسیاتی جبر کے طور پر اس کا ساری زندگی پیچھا کرتی رہی۔ جب وہ تیس سال کا ہو گیا تو اس کی ماں اور خالہ اس کی شادی کا سوچنے لگے۔ جب بیٹے سے اس حوالے سے بات کی گئی تو اس نے فوراً کہا۔ "فضل دین مزارع کے بیٹے کو اپنی بیٹی کون دے گا؟"(۲۵)

یہ وہ سوال ہے جو فضل دین مزارع کے بیٹے کے دل و دماغ میں ہر وقت گونجتا رہتا ہے۔ وہ ماں کو اپنی اہمیت بتاتے ہوئے سمجھاتا ہے کہ مزارع کے بیٹے کو کوئی بھی لڑکی نہیں دے گا لیکن اس کی ماں بیٹے کے رشتے کے لیے ڈیوڑھی ڈیوڑھی گھومتی پھرتی ہے۔ اس کی ماں کو ہر ایک کی زبان سے کچھ ایسے کلمات سننے کو ملتے ہیں کہ جس نے اُن کی کم حیثیتی کو مزید نمایاں کر دیا۔ فضل دین مزارع کے سارے تمغے اور ڈگریاں بھی اس کے لیے رشتے کا سبب نہ بن سکے اس کی وجہ اُس کا مزارع کا بیٹا ہونا تھا۔ ماں جب بیٹے کے لیے رشتے کی تلاش میں گھر گھر جاتی ہے تو اسے کئی طرح کے کلمات کا سامنا کرنا پڑا۔ جسے فضل دین مزارع کا بیٹا کچھ اس انداز میں لکھتا ہے۔

"اور لکھا اُس نے اب کے بار کہ "میں ہوں اور نہیں بھی۔"

اور لکھا، "زندگی جبر کے پہلو میں اونگھتی دوشیزہ۔"

اور لکھا، "گدھا گوشت بھی کھائے تو بھی گدھا"

اور لکھا، "کتے کے سر سینگ نہیں اُگتے، اُگ آئیں تو اسے گھر نہیں رکھتے۔"

اور لکھا، تُھوک نگلنے کی بجائے اپنے اوپر اُگل، اوقات یاد رہے گی۔"(۲۶)

درج بالا اقتباس سے فضل دین مزارع کے بیٹے کا نفسیاتی پہلو نمایاں نظر آتا ہے جو صرف مزارع کا بیٹا ہونے کی وجہ سے کم حیثیت و کم اہم سمجھا گیا۔ جس نے اُسے نفسیاتی ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ اُس کے ماں باپ نے وڈیروں کی زمینوں میں ہل چلا کر خون پسینے کی کمائی سے اسے پڑھایا لکھایا۔ وہ پڑھ لکھ گیا اور کئی اعزازات بھی اپنے نام کر لیے لیکن اس کے باوجود اس کی شناخت اور پہچان وہی مزارع رہی۔ لوگوں نے اسے اس کے باپ کی وجہ سے پہچانا اور اس کی زندگی بھر کی لگن اور محنت کو نظر انداز کر دیا۔ اس بات نے فضل دین مزارع کو ایک نفسیاتی جبر میں مبتلا کر دیا کہ وہ چاہے جتنا مرضی کچھ کر لے یہ شناخت اسے ہر جگہ ہمیشہ چھوٹا گردانے گی۔ اسی جبر کے نتیجے میں وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اور خود پر تھوکتا ہے۔ اُس کی ماں اسے تسلیاں دیتی ہیں لیکن وہ اپنے لکھے اور ادھ لکھے پیمان سب کچھ لیے خودکشی کر لیتا ہے۔ جو ایک نفسیاتی جبر کا نتیجہ تھا۔ افسانے کا اختتام ملاحظہ کیجیے:

"اس سے اگلی رات اس نے دیکھا اپنے آپ کو پھر اپنے اوپر تھوکتے ہوئے۔ منظر دیر دیر تک اس کے گرد منڈلاتا، اپنا آپ اس کے مضمحل چہرے پر پٹختا اور اَنی دار طلائی کھسّہ بن اس کے سر پر تڑاخ تڑاخ برستا ہے۔ اور اس رات اس نے کوشش کی کہ اپنے آپ کو سنبھالے اور پیمان باندھے اور لکھے۔ مگر وہ تڑختا رہا تیز تیز، دراڑیں شگاف بنیں، شگاف خندق ہوئے اور راکھ اور دھول اور دھواں پھیلتا گیا۔ بس پھیلتا ہی گیا۔

۔۔۔وہ بڑبڑایا، "جو سر اٹھا تھا وہ اٹھنے کے لیے نہیں تھا"

"میں زمیں سے ہوں اور زمیں مجھ سے ہے"

خزاں موسموں میں ہلاکت بدترین ہلاکت ہے"

۔۔۔مایوسی سمٹ سمٹ اس کے گرد اگرد سمٹی، اور سمٹی۔

اس نے اپنے لکھے اور ادھ لکھے بیان بغل تلے دابے، زمین کی گہرائیوں کو اُترا اور اترتا ہی چلا گیا۔

رات کے پچھلے پہر کا آخری منظر

فضل دین مزارع کے گھر کہرام اور ماتم کی تیز آوازیں۔"(۲۷)

شفیق انجم کے ہاں نفسیاتی تناظر میں جس جبر کو کثرت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ اپنی ذات کا جبر ہے جو شناخت اور عدم شناخت کے مابین تناؤ کا باعث ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے شناخت اور عدم شناخت کے جبر کو ایک دوسرے کی تقابلی صورتحال میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نفسیاتی جبر سماجی صورتحال کی دین ہے۔ سماجی رویے ان کی کہانیوں کو نفسیاتی حد تک متاثر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ذیل میں ڈاکٹر شفیق انجم کے افسانوں میں سماجی جبریت کی وضاحت کی جارہی ہے۔

ج۔ شفیق انجم کے افسانوں میں جبر (Determinism) کے سماجی تناظرات

شفیق انجم کے افسانوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانے بہت پیچیدہ اور تہہ دار ہیں۔ ان کے افسانوں میں بیک وقت کئی موضوعات پائے جاتے ہیں جن میں تاریخ کے کھنڈرات سے لے کر دورِ حاضر کے مسائل اور سماجی جبر جیسے عناصر باکثرت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "میں + میں" ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آیا۔ "میں + میں" کا عنوان بھی بہت معنی خیز اور تہہ دار ہے جس میں کئی موضوعات پر مبنی افسانے ڈاکٹر شفیق انجم کے فلسفی ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا افسانوی مجموعہ "لکھت لکھتی رہی" ۲۰۱۱ء اور تیسرا افسانوی مجموعہ "روشنی آواز دیتی ہے" کے عنوان سے ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا۔ ۹ / افسانوں پر مشتمل یہ تیسرا افسانوی مجموعہ کمالِ فن کی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان افسانوں میں ایک خاص خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں شعری وسائل سے بھی ایک حد تک کام لیا ہے اور اپنی نثر کو خوب سے خوب تر نکھارنے کی کوشش کی ہے۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد:

"شفیق انجم کے افسانے موضوعاتی طور پر بہت پہلو دار اور دبیز ہیں۔اس لیے ان کے اسلوب نے بڑی معاونت کی ہے جس میں نثری خوبیوں کے ساتھ ساتھ شعری وسائل سے بھی بھرپور کام لیا ہے"(۲۸)

فلسفیانہ ذہن رکھنے والے شفیق انجم کے افسانے اپنے دور کی بھرپور نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ وہ اپنے افسانوں میں دورِ حاضر کے مسائل کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کی کھوج میں ڈوب کر اپنے مشاہدے کو بڑی حد تک بیان کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ان کے افسانوں میں بیک وقت علامت، نفسیات، تاریخ، رومانویت، ادھوری خواہشات، حسرتیں اور سماجی جبر جیسے پہلو خصوصی طور پر نمایاں ہیں۔بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق افسانوی ادب نے بھی کئی کروٹیں بدلی ہیں، اور کئی موضوعات کو اپنے اندر جگہ دی ہے۔صبا اکرام اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

"جدید عہد کی عطا کردہ بے یقینی اور بے اطمینانی موجودہ نسل کی روح پر جبر اور ناانصافیوں کا جو تیزاب ہر لمحہ قطرہ قطرہ ٹپکا رہی ہے اس سے اس نسل کو کب نجات ملے گی اور نجات نصیب ہو گی بھی یا نہیں اس کا تو علم نہیں"۔(۲۹)

سماجی جبر پر اگر بحیثیت موضوع بات کی جائے تو شروع ہی سے افسانوی ادب کا یہ خاصا مقبول موضوع رہا ہے۔"پریم چند" جسے افسانوی ادب کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے، ان کے ہاں بھی سماجی جبر نکھر کر سامنے آیا ہے۔انھوں نے "کفن" جیسا لازوال افسانہ لکھ کر اپنے سماج کو نہ صرف آئینہ دکھایا بلکہ سماجی و معاشرتی بے حسی اور ظلم و ستم کے خلاف اپنی کہانیوں میں علم بلند کیا۔ان کے بعد بھی کئی اہلِ قلم نے اپنی کہانیوں میں سماجی جبر کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ان لکھنے والوں میں چند ایک اہم نام انتظار حسین، عصمت چغتائی، منٹو اور ڈاکٹر رشید امجد کے علاوہ شفیق انجم نے بھی اس موضوع کو ایک خاص انداز میں برتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ایک خاص تکنیک استعمال کر کے منفرد راہ اپنائی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو روایت سے بھی دور نہیں رکھ سکے، اور روایت کے ساتھ جڑنے کے باوجود نہ صرف اپنی ایک الگ پہچان بنائی بلکہ ادب کی دنیا میں کافی مقبولیت بھی حاصل کی۔اسی تناظر میں اگر ان کے افسانوی مجموعے "روشنی آواز دیتی ہے" پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس بات کی اہمیت واضح ہو جائے گی کہ وہ کس طرح سماجی جبر (چاہے وہ تاریخ

کے پردے میں ہو یا کسی تناظر کی صورت میں) کو بیان کرنے میں اپنا ہنر دکھاتے ہیں۔ڈاکٹر طاہرہ اقبال شفیق انجم کے افسانوں کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "شفیق انجم کے افسانہ 'گھنی سیاہ رات' میں پاکستان میں مسلط فوجی قبضے اور اس زمین کے دکھوں کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں ۱۹۴۷ء کے اگست مہینے سے اپریل دو ہزار سات کے درمیان ہورے ساٹھ برسوں پر ایک ہی منظر چھایا ہوا دکھایا گیا ہے"۔ (۳۰)

انھوں نے اپنے اکثر افسانوں میں "روشنی اور اندھیرے" کو بطورِ علامت استعمال کیا ہے، روشنی اور اندھیرے کو کہیں "زندگی و موت" کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے تو کہیں "نیکی و بدی" کے معنوں میں، اس طرح وہ اپنی کہانیوں میں قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔انھوں نے اپنی کہانیوں میں واقعات (ان واقعات کا تعلق چاہے مذہب سے ہو، تاریخ سے ہو یا دورِ حاضر کے مسائل سے) کی جڑیں کھوج کر قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ان کا افسانہ "روشنی آواز دیتی ہے" بھی اسی تناظر میں لکھا گیا ہے، جس میں تاریخی واقعات کے ذریعے سماجی جبر کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔افسانے کے عنوان (روشنی آواز دیتی ہے) میں روشنی کو "زندگی" کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، یعنی "زندگی" ان لوگوں کو پکارتی ہے جو جینے کا ہنر جانتے ہیں۔جہاں موت ہر طرف منہ کھولے ہر کسی کو ہڑپ رہی ہو تو وہاں "زندگی" سہارا مانگتی ہے۔مصنف نے یہاں "زندگی و موت" کو بطورِ موضوع استعمال کر کے زمانے میں ہونے والے سماجی جبر کو بیان کیا ہے۔ڈاکٹر شفیق انجم نے اس افسانے (روشنی آواز دیتی ہے) کی کہانی کچھ یوں بیان کی ہے کہ زمانہ قدیم میں من پسند کی عورتوں، اناج اور ملکیت کے لیے لشکر کے لشکر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے اور خون کی ندیاں بہا دیتے۔پتھروں، تلواروں کے ساتھ ایک دوسرے کو موٹ کے گھاٹ اتارتے اور ایک فریق کی شکست پر دوسرا نہ صرف جشن مناتا بلکہ اپنی من پسند کی عورتوں کو چن لیا جاتا اور باقیوں کو بکریوں کے ریوڑ کی صورت میں فروخت کیا جاتا۔لوگ آتے پسند کرتے اور پیسے دے کر اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرتے، جیسے جیسے وقت کروٹیں لیتا گیا ظلم و ستم بھی کئی نئے لباس اوڑھ کر رونما ہوتا گیا یہاں تک کہ تلوار کی جگہ ایٹم بم اور ایک چھوٹے سے بٹن نے لے لی۔ایک بٹن دبایا اور بستیوں کی بستیاں الٹتی گئیں اور لوگوں کے چیتھڑے ہواؤں میں اڑتے گئے۔افسانے کا یہ اقتباس اس منظر کی خوب عکاسی کرتا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"کہیں کوئی بٹن دباتا ہے۔ کوئی سٹھیایا ہوا وحشی قہقہہ لگاتا ہے۔ بھونچال اٹھتا ہے ۔۔۔اور سناٹا چھاجاتا ہے۔ مختلف سمتوں میں بیٹھے جنونی استمنا کرتے، ہانپتے، کانپتے اپنے بٹنوں کی سمت بھاگتے ہیں۔ زمیں کی تہوں سے، سمندروں سے، آسمانوں سے موت دھاڑتی ہوئی بستیوں پر ٹوٹ پڑتی ہے۔۔۔پگھلا دینے والی آگ پلک جھپکنے میں سب کچھ چاٹ کھاتی ہے اور راکھ اور دھوئیں اور دھول کے بادل آسمانوں چھتر بناتے تیرنے لگتے ہیں۔ گھپ اندھیرا چھاجاتا ہے اور تابکاری کی برسات شروع ہو جاتی ہے"۔ (۳۱)

درج بالا اقتباس سے سماجی جبر نہ صرف واضح ہوتا ہے کہ بلکہ ایسے خوفناک مناظر کی تصویر سامنے آتی ہے کہ قاری کا دل لرزنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے یہاں ان لوگوں کی بھی عکاسی کی ہے جن کے قدموں میں زندگی دوڑتی چلی جاتی ہے اور انھیں زندگی گزارنے کا ہنر معلوم ہے اور جو اسے خدا کی دی ہوئی ایک نعمت تصور کرتے ہیں۔ وقت، رفتار، روشنی اور اندھیرے کو مختلف معنوں میں استعمال کر کے تجسس کی فضا کو ابھارا گیا ہے، اس کے علاوہ سماجی ظلم و ستم کو بیان کرتے ہوئے مصنف کا لہجہ کہیں طنزیہ تو کہیں حد سے زیادہ سخت معلوم ہوتا ہے۔ مختلف زمانے میں ہونے والے ظلم و ستم کا نقشہ بہت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔

اس مجموعے (روشنی آواز دیتی ہے) میں شامل ایک اور افسانے "مٹی بوسہ دیتی ہے" کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں دو سماجوں کا تقابل کرا کر سماجی جبر کو ایک نئے زاویے سے مصنف نے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ شفیق انجم کے ہاں اکثر یہ دیکھنے کو آیا ہے کہ وہ مختلف چیزوں کا تقابل کر کے اپنا مدعا بیان کرتے ہیں اور یہ ان کے ہاں ایک بہت بڑی خصوصیت پائی جاتی ہے، جس سے بات کو نہ صرف واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے بلکہ قاری کو بھی کہانی سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اس افسانے (مٹی بوسہ دیتی ہے) میں مصنف نے ایک ایسے شہری کی کہانی بیان کی ہے جو اپنے سماج میں ہر وقت کی فکر مندی، ان چاہی خبر گیری، ذمہ داریوں، چیخ و پکار اور ہر وقت کے بے ہنگم شور سے تنگ آکر دوسرے سماج میں جا کر رہنے کو ترجیح دیتا ہے، اور مختلف بندھنوں کے حصار سے نکل کر اپنی مرضی سے زندگی کے کچھ لمحات گزارنا چاہتا ہے۔ وہ شخص جو اپنی خوشی اور سکون کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر باہر جاتا ہے لیکن وہاں بھی مایوسی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کوئی بھی سماج چاہے

جتنی بھی ترقی کر لے اپنے آپ کو مکمل نہیں کر سکتا۔ افسانے میں "نحیف" شخص یعنی کردار کے اندر کا آدمی بڑبڑاتا ہے، مصنف نے اس منظر کو کچھ یو بیان کیا ہے کہ:

> "سنتے آئے ہیں قومیں جب اپنے عروج کے زمانے میں ہوتی ہیں تو ان کے نرت بھاؤ کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ ترقی کی چکاچوند میں بظاہر سب آراستہ و پیراستہ اور ایک خاص ڈھنگ، سلیقے میں ڈھلا نظر آتا ہے لیکن یہیں کہیں وہ دراڑیں بھی ہوتی ہیں جن میں جھانک کر دیکھو تو کھوپڑیوں کے انبار نظر پڑتے ہیں"۔ (۳۲)

اچھے لباس، اچھے کھانوں اور خوشنما چہروں کا نام آزادی نہیں ہے۔ اگر ان سب چیزوں میں سکون ہوتا تو ترقی یافتہ سماج سب سے زیادہ خوش گوار اور سکون کی زندگی گزار رہے ہوتے۔ مصنف نے وہاں کے سماج کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ دنیا کی ہر سہولت میسر ہونے کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کے درمیان دراڑیں ہی دراڑیں ہیں اور ریشمی غلاف اوڑھے یہ لوگ اندر سے کتنے خالی خالی ہیں۔ بے بسی و مجبوری ان کے چہروں سے ٹپکتی ہے، یہاں تک کہ بات کرنے پر بھی پابندی ہے، گویا کسی نے شہ رگ پر خنجر رکھا ہوا ہے۔ کچھ ایسی باتیں جو وہ سن تو لیتے ہیں مگر زبان کو حرکت دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایک ایسا سماج جہاں بات کرنے پر پابندی ہو، لوگوں کی حرکت و نقل پر نظر رکھنے کے لیے جگہ جگہ کیمرے لگائے گئے ہوں، وہ سماج کیا کسی کو سکون دے گا جہاں بولنے کی اجازت نہ ہو۔ ان تمام پہلوؤں پر نحیف شخص یعنی کردار کے اندر کا شخص بڑبڑاتا ہے اور کہتا ہے کہ:

> "کھوپڑیوں کے انبار لگتے ہیں تو ترقی کی ایک سیڑھی بنتی ہے اور اگر سیڑھی در سیڑھی بنانی ہو تو مار دھاڑ بھی ویسی ہی کرنی پڑے گی۔ تم نے ابھی تک کوئی مرغی بھی ذبح ہوتے نہیں دیکھی لیکن جس زمین پر تم بیٹھے ہو یہاں لوگوں کو ٹینکوں تلے روند کر فتح کے جھنڈے گاڑے گئے ہیں"۔ (۳۳)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے ان ترقی یافتہ سماجوں پر بات کی ہے جنھوں نے بستیوں کی بستیاں ٹینکوں تلے روند کر ترقی کے جھنڈے گاڑے ہیں اور آج وہ اپنے آپ کو مہذب اور انسانی حقوق کے علمبردار سمجھتے ہیں۔ اس افسانے (مٹی بوسہ دیتی ہے) میں دو سماجوں کا آپس میں تقابل کر کے مصنف نے ایسے لوگوں کی سوچوں پر پانی پھیر دیا جو اپنے سماج و معاشرے کی بجائے ہر جگہ مغرب کو مثال کے طور پیش کرتے ہیں، ان

کی آزادی اور ترقیوں کے گیت گانے والوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مال و اسباب کی کثرت ،کام کی فروانی اگر آزادی اور پر سکون زندگی کا نام ہے تو وہاں کے لوگ سب سے زیادہ خوش ہوتے۔ خوشی و سکون اگر عمدہ و نفیس چہروں، اچھے لباسوں اور آرام دہ رہائشوں میں ہوتا تو یہ سب کچھ ان کے پاس موجود ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان ریشمی غلافوں کے بیچوں بیچ اگر جھانک کر دیکھو تو دراڑیں ہی دراڑیں موجود ہیں۔ مصنف نے دو سماجوں کے تقابل کے ذریعے نہ صرف معاشرے میں ہونے والے سماجی جبر کو واضح کیا ہے بلکہ اپنے سماج میں وہ تمام خوشیاں جو ان چاہی خبر گیری اور بندھنوں میں ہیں، ان کا شباب و کباب، شراب اور رقص والے سماج میں نام تک نہیں۔ عجیب سا ایک خلا ہے جو اچھے کھانے پینے کے باوجود نہیں بھرتا۔

اگر شفیق انجم کے دوسرے افسانوی مجموعے "لکھت لکھتی رہی" کی بات کی جائے تو یہاں پر ان کا اسلوب قدرے باقی مجموعوں سے شاعرانہ محسوس ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کہانیوں میں اپنی ذات (بطور کردار) کی تلاش اس مجموعے کا خاصا عنصر ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار اپنی ذات کی تلاش میں سرگرداں ہو کر فنا کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ معاشرے میں ہونے والے جبر کو ان کرداروں کے ذریعے پیش کرنا اور بے حسی کو سہتے سہتے کرداروں کا موت کو گلے لگانا مصنف نے ایک خاص پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم اپنے اردگرد کے غلاظت بھرے معاشرے میں تنگ سوچ رکھنے والے کرداروں کو نہ صرف کہانی میں بیان کر دیتے ہیں بلکہ ان کی خامیوں کو بیان کرتے کرتے ان کا لہجہ بھی قدرے کھردرا ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ اس سماج میں اچھا بننے کی لاکھ کوشش کے باوجود انسان معاشرے کی امیدوں پر نہیں اتر سکتا۔ ڈاکٹر شفیق انجم نے افسانہ "دنیا دکھ ہے" بھی اسی تناظر میں لکھا ہے۔ عنوان سے بھی واضح ہے کہ دنیا ایک ایسا قید خانہ ہے جہاں اندھیروں کا راج ہی راج ہے، جہاں روشنی بکھیرنے والوں کو کچلا جاتا ہے اور اندھیروں سے اپنائیت کی راہیں ہموار کی جاتی ہیں۔ افسانہ "دنیا دکھ ہے" کی کہانی مصنف نے کچھ یوں بیان کی ہے کہ ایک ایسا نوجوان جو ان "فضل دین مزارع" کا بیٹا ہے اور علی پور خورد کا رہائشی ہے۔ کھیلنے کودنے کے دنوں میں اس نے والدین کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹایا اور ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کو بھی وقت دیتا رہا جب کہ اس کے ہم عمر کھیلتے اور اس پر پھبتیاں کستے۔ اس کے پھٹے پرانے کپڑوں پر لوگوں کی نظریں آر پار ہوتیں لیکن اس نے اپنی آنکھوں میں کچھ خواب سجا رکھے ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے اس نے اپنے آپ سے کچھ پیمان کر رکھے تھے۔ لوگ اس کے حالات پر پھبتیاں کستے اور ہنستے لیکن وہ اپنے کام میں مگن رہتا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ ترقی کی منازل

طے کرتا گیا آخر ایک دن وہ سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک پہنچ گیا، اس نے پیمان کر لیا کہ سہارا وہی ہے جو اپنے آپ کو سہار سکے۔ بس وہ محنت کرتا گیا اور فتح اس کے قدم چومتی گئی، تمغے، نشان اور ڈگریاں اس نے اپنے نام کر لیں۔ لوگ اس پر پھول نچھاور کرتے اور تعریفوں کے گن گاتے، مصنف نے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

> "اس نے اپنا بستہ درزی کی دکان سے کترنیں جوڑ جوڑ خود بنایا تھا اور ردی کاغذوں میں سے صاف کاغذ چن چن اپنی کاپی سوئی دھاگے سے خود نتھی کی تھی۔ رات کو گھپ اندھیروں میں دیا جلا جلا اس نے سبق یاد کیے اور چاند راتوں میں چاندنی میں بیٹھ بیٹھ وہ انھیں لکھا کرتا۔ پرانے سیلوں سے سکے نکال کر انھیں پیس پیس وہ دوات کے لیے سیاہی بناتا اور سوکھے کانے جمع کر کر ان کی قلمیں تراشتا"۔ (۳۴)

ان تمام تر مشکلات کے باوجود اس نے اپنے پیمانوں کو منزلِ مقصود پر پہنچانا اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ ان تمام منازل کو طے کرنے کے بعد اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ "میں ہوں"۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک خامی کی وجہ سے ہزاروں خوبیاں اس کے منہ پر مار دی جائیں گی اور سالوں سال کی محنت پر لوگ تھوکیں گے۔ عمر کے جب تیس سال پورے ہوئے تو گھر والوں کو شادی کی فکر ہوئی، ماں اس سے کہتی ایک بار تو ہاں کر دے شہر کی سب سے خوبصورت لڑکی تمھاری دلہن بنے گی لیکن اس کے اندر کا شخص بڑبڑاتا اور کہتا "فضل دین مزارع" کے بیٹے کو کون لڑکی دے گا۔ وہ سماج کے رویوں سے بخوبی واقف تھا کیوں کہ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا۔ ماں سے جب رہا نہ گیا تو اس نے گھر گھر جا کر تلاش شروع کی لیکن ناکامی اس کا مقدر تھی، اس بات کی جب اسے خبر ہوئی اور بتانے والے نے بتایا تو اس کے اندر دراڑیں ہی دراڑیں پڑتی گئیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "اور پھر ایک دن اس نے سنا کہ مضطرب ماں سے رہا نہ گیا، وہ ڈیوڑھی ڈیوڑھی گھوم آئی۔ اس نے سنا۔۔۔ آگے بہت کچھ سننے کو اور بتانے والا بتاتا رہا مگر یہ سب کچھ تو وہ بہت پہلے سے جانتا تھا۔ سو اس نے سنی آدھی پوری بات اور اندر ہی اندر تڑخا، تیز تیز تڑخا۔ دراڑیں شگاف بنیں، شگاف خندق ہوئے اور راکھ اور دھول اور دھواں پھیلتا گیا"۔ (۳۵)

انسان اندر سے مر جاتا ہے جب اس کے آرمانوں کا خون کیا جاتا ہے لیکن اپنے آپ کو سنبھالنے کی ہزاروں کوششوں کے باوجود سماج کا رویہ اندر ہی اندر اسے چاٹ جاتا ہے، وہی سماج جو تعریفیں کرتا کرتا تھکتا نہیں وقت آنے پر منہ پر تھوکنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ جب امیدوں کے بندھن کرچی کرچی ہو کر ٹوٹ جائیں تو آدمی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے لیے دنیا کی بجائے زمین میں چھپنا بہتر سمجھتا ہے، سماج کے اس تلخ و بھیانک رویے کو دیکھتے ہوئے اس نے پہلی بار لکھا:

"میں ہوں اور نہیں بھی، اور لکھا "زندگی جبر کے پہلو میں اونگھتی دوشیزہ"، اور لکھا کہ "تھوک نگلنے کی بجائے اپنے اوپر اگل، اوقات یاد رہے گی"۔ (۳۶)

مایوسی کے بادل جب حد سے زیادہ برسنا شروع کر دیں تو انسان کو اپنا آپ بھی بوجھ لگنے لگتا ہے اور وہ اس بوجھ کو جلد ہی ٹھکانے لگانے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ جب سماج اس کو اوقات یاد دلانے کے لیے منہ پر تھوکنا شروع کر دے اور ڈگریاں، تمغے منہ پر مار دیے جائیں، سالوں سال کی محنت پر لات مار دی جائے تو آدمی جیتے جی زمیں میں دھنس جاتا ہے۔

مصنف نے اس افسانے (دنیا دکھ ہے) میں سماجی المیے کو نہ صرف ایک خاص انداز میں بیان کیا بلکہ سماجی رویوں اور جبر پر بھی اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس افسانے (دنیا دکھ ہے) میں جابجا شاعرانہ جملوں کا استعمال بھی افسانے کے معیار کو بڑھاتا ہے اور اسلوب میں شائستگی پیدا کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔ اس افسانے میں جس جبر سے آزادی کے لیے انسان اپنی ذات میں گم ہوتا نظر آتا ہے وہ بظاہر تو آزادی ہوتی ہے لیکن ایک لحاظ سے وہ لاشعوری طور پر مایوسیوں اور ناامیدیوں کی دلدل میں اپنے آپ کو قید کر رہا ہوتا ہے۔ اس قسم کا اظہار بھی اس افسانے سے نمایاں ہوتا ہے۔ آزادی کے اس تصور کے بارے میں بختیار حسین صدیقی لکھتے ہیں:

"آزادی کبھی بھی مطلقیت کا روپ نہیں دھار سکتی وہ صرف اضافیت ہی کا جامہ پہن سکتی ہے، پس ہر شخص کو ایک جیسی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی"۔ (۳۷)

شفیق انجم نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے (میں + میں) میں علامت کے ساتھ ساتھ تمثیل کو بھی نہایت کامیابی کے ساتھ برتا ہے، اور اس کے علاوہ تقابل کے ذریعے کہانی بیان کر کے قاری کی توجہ ان چھوٹے

چھوٹے پہلوؤں کی طرف مبذول کروائی ہے، جن پر ہمارے معاشرے میں خاص توجہ نہیں دی جاتی۔اس مجموعے میں رومانویت کے ساتھ ساتھ عام عوامی سطح کے جبر کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔پرندے، گھوڑے اور سانپ جیسی علامتوں کے استعمال سے کہانیوں میں ایک منفرد اور جدید انداز اپنایا گیا ہے۔ان علامتوں کے ذریعے "شفیق انجم "بظاہر چھوٹے چھوٹے لفظوں میں بہت بڑا المیہ پیش کر جاتے ہیں، جس کی وجہ سے کہانیاں نہ صرف قاری کی توجہ کا مرکز بنتی ہیں بلکہ پڑھنے والا ان کہانیوں میں دلچسپی بھی لینے لگ لگتا ہے۔اس مجموعے میں شامل افسانہ "چلمنوں کے اس پار" ایک علامتی افسانہ ہے، جس میں روشنی اور اندھیرے کی علامت کو استعمال کر کے کہانی کو کامیابی کے ساتھ نقطہ اختتام تک پہنچایا گیا ہے۔عنوان (چلمنوں کے اس پار) پر غور کیا جائے تو یہ کانوں کا بنا ہوا ایک پردہ ہوتا ہے۔ "چلمنوں کے اس پار "کا مطلب روشنی کے اس طرف جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔وہ اندھیرا جہاں ایک بار آدمی چلا جائے تو واپسی کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں ۔اس کے علاوہ مصنف نے اس جبر کو بھی بیان کیا ہے جس کی بدولت انسان، انسان سے جدا ہو جاتا ہے اور اپنے خوابوں کی تکمیل میں دن رات سرگرداں رہتا ہے۔شفیق انجم نے اس افسانے (چلمنوں کے اس پار) کی کہانی کو بڑے ہی علامتی انداز کے ساتھ بیان کیا ہے کہ میں (کردار) جب اپنے بچپن کے ایام گزار رہا تھا تو ہر طرف روشنی ہی روشنی اسے نظر آتی، وہ لوگوں کی باتوں کو سنتا اور سمجھتا اور لوگ اس کی باتوں کو سنتے، سمجھتے تھے۔چار سو نور ہی نور بکھیرنے والے موجود تھے، لیکن جیسے جیسے میں (کردار) عمر کی ان حدود سے نکلتا گیا ویسے ویسے "روشنی "تھرتھرانے لگی اور اندھیروں سے اپنائیت کی راہیں ہموار ہوتی چلی گئیں۔اب تو یہ حال ہے کہ لوگوں کے کہنے کے باوجود ہر طرف مجھے (کردار) کو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر افسانے (چلمنوں کے اس پار) کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "دیکھنے والے کہتے ہیں روشنی ہے،نور ہے ،رنگا رنگی ہے ،خوبصورتی ہے ۔۔۔ہوگی۔۔۔شاید ایسا ہی ہوگا لیکن میرے ہاں تو سب اندھیرا ہے ۔۔۔سب اندھیرا۔ غم کی فصیلوں کے اس طرف سب اندھیرا ہی اندھیرا ہے"۔(۳۸)

جیسے جیسے انسان عمر کی بلندیوں کو چھوتا جاتا ہے، ساتھ ساتھ رسیلے خواب اندھیروں کے جنگل کا راستہ ہموار کرتے جاتے ہیں۔مصنف نے بھی اس افسانے (چلمنوں کے اس پار) میں یہی نظریہ پیش کیا ہے، اور اپنے خوابوں میں مگن اس جبر کو پیش کیا ہے جو انسان کو قریبی رشتے داروں اور دوستوں سے بھی جدا کر دیتا

ہے۔ جب انسان اپنے خوابوں میں خود کو تخت افروز یعنی ترقیوں کی سیڑھیاں عبور کرتے دیکھتا ہے تو دن رات یہی مناظر اس کی آنکھوں میں گھومنے لگ جاتے ہیں اور لوگوں سے فاصلے بڑھتے جاتے ہیں، وہ لوگ جو ہر وقت نور ہی نور بکھیرتے تھے ان سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ مصنف نے یہاں ان لوگوں کی عکاسی کی ہے جو اپنے خوابوں میں مگن ان روشنیوں کو روند کر چلے جاتے ہیں، جو روشنیاں پہلے ان کی خوشی و مسرت کا سبب تھیں اور وہ وہی کرتے ہیں جو انھوں نے ٹھان لی ہوتی ہے ،لوگوں کی سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ کئی وہ آنچل جن کی خوشیاں ان سے بندھی ہوتی ہیں، ان کو پیٹھ پیچھے پھینک کر ان اندھیروں کی طرف چلے جاتے ہیں جہاں سے چاہتے ہوئے بھی واپسی ناممکن ہو جاتی ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس دیکھیے:

> "نہیں بتا سکتا مجھے کہاں جانا ہے۔ چلتے وقت میں نے اور تو بہت کچھ سوچا تھا اور جو سوچا تھا وہی کچھ کرتا بھی رہا مگر یہ نہیں سوچا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اندر ہی اندر بولنے والا بھی اس بارے خاموش ہے۔ میں واپس ہونا چاہتا ہوں مگر جانتا ہوں کہ واپسی کے تمام راستے مسدود ہیں"۔ (۳۹)

بغیر سوچے سمجھے جب انسان وقتی رنگینیاں اور مسرتیں دیکھ کر گمنام راستوں پر چل پڑتا ہے تو ایک نہ ایک دن اسے پچھتاوا ضرور ہوتا ہے مگر اس وقت پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے اور وہ ساری زندگی انھی اندھیروں میں بھٹکتا گزار دیتا ہے۔ مصنف نے اس افسانے میں بھی اس المیہ کو علامت کے پردے میں بہت عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس مجموعے کے ایک اور افسانے (چپ چاپ چلے سودائی۔۔۔ہُو) میں شفیق انجم نے دو محبت کرنے والے کرداروں کی کہانی کے ذریعے "زندگی و موت" کے جبر کے ساتھ ساتھ سماجی جبر کو بھی چھپے لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ اس افسانے (چپ چاپ چلے سودائی۔۔۔ہو) میں ایک ایسے نوجوان کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے جس کی سانسیں "زندگی و موت" کی کشمکش میں چل رہی ہوتی ہیں اور بوڑھی سفید بالوں والی "ماں" مسلسل اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر روئے جا رہی ہے، پاس کھڑا بے بس و لاچار بوڑھا ڈاکٹر کو منتیں کر رہا ہے۔ نیلی نیلی آنکھوں میں آنسوں لیے گم صم لڑکی جو اس نوجوان سے محبت کے بندھن میں بندھی ہوئی تھی اور منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ مصنف نے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

"سب کی آنکھوں میں نمی تھی مگر اس کی آنکھیں۔۔۔اس کی آنکھیں نمی خشک سے بے نیاز سو رہی تھیں۔وہ تو سوتے ہوئے بھی مسکرا دیا کرتا تھا۔مگر آج۔۔۔اے کاش کوئی اس کی مسکراہٹیں واپس لے آئے۔پھول سا چہرہ کتنا بجھ کے رہ گیا ہے۔سب سے زیادہ سفید بالوں والی بوڑھی پریشان تھی"۔(۴۰)

مصنف نے والدین کی اولاد کے لیے تڑپ و درد کو افسانے میں اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ سماجی پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی ہے، جس سے سماج میں پائے جانے والے بے شمار خامیاں بھی واضح ہوتی ہیں۔افسانے کے اس اقتباس سے سماجی خامیوں کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

"ڈاکٹر کے خیال میں اب کسی خیر کی امید رکھنا بے سود تھا۔بوڑھے کو تھپکی دیتے ہوئے وہ اپنے ساتھ باہر لے آیا،واجبات کی ادائیگی کر دیجیے،اب ہمارے بس میں کچھ نہیں"۔(۴۱)

نوجوان مسلسل قے کے ساتھ خون کے لوتھڑے باہر اگل رہا تھا اور ڈاکٹر نے کسی امید کا رکھنا بے سود خیال کیا۔مصنف نے یہاں پر معاشرے کے اس المیہ کو بھی پیش کیا ہے جو ہمارے معاشرے کی بہت بڑی خامی ہے۔انسانیت کی خاطر جب کسی مریض کی موت ہو جائے تو ڈاکٹروں کو چاہیے تھا کہ وہ لواحقین کو حوصلہ دیتے لیکن بجائے اس کے وہ فوراً واجبات کا مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں۔نیلی نیلی آنکھوں والی خوبصورت لڑکی سے ضبط نہ ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر وہ تمام وعدے یاد دلانے کی کوشش کی جو انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کر رکھے تھے اور کہا کہ تم نے تو پوری زندگی ساتھ نبھانے کا عزم کیا تھا،کہاں گئے تمھارے وعدے۔وہ مسلسل آگے بڑھتی گئی حتیٰ کہ وہ اس کے چہرے پر بچھ پڑی،مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"پیلی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور نیلگوں پانی پھیل پھیل سمندر بنتا چلا گیا۔آنکھیں،آنکھوں میں اتر رہی تھیں،نوجوان کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری اور گم ہو گئی۔اظہار و معنویت کے نئے سفر کا آغاز ہو رہا تھا۔زندگی نے زندگی کو اچک لیا مگر کسی کو خبر نہ ہوئی،لڑکی دھم سے نوجوان کے چہرے پر گری تو سب ہڑبڑا اٹھے،ڈاکٹر آیا،دونوں کو ہلا جلا کر دیکھا،نبض ٹٹولی اور نفی میں سر ہلایا"۔(۴۲)

مصنف نے اس افسانے (چپ چاپ چلے سودائی۔۔۔ہُو) میں موت کے مناظر کے ساتھ ساتھ دو چاہنے والوں کی محبت کو اس طرح بیان کیا کہ دو میں سے ایک نکال دینے پر ایک بھی باقی نہیں رہتا۔جب نوجوان کے بچنے کی موت باقی نہ رہی تو لڑکی پہلے سے موت کو گلے لگانے کے لیے تیار تھی، کیوں کہ اس کے سجائے ہوئے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔اب اسے زندگی سے کوئی لگاؤ نہ تھا،اس لیے جب وہ اپنے محبوب کے چہرے پر بچھی تو اس کی روح بھی پرواز کر گئی۔

افسانہ "تھک کر گرتے شوخ پرندے" اس مجموعے (میں + میں) کا شاہکار افسانہ ہے ،جس میں علامت کے ساتھ ساتھ تقابل جیسی خصوصیات بھی شامل ہیں۔عنوان (تھک کر گرتے شوخ پرندے) میں "پرندے" کو عروج اور ترقی کے معنوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ اس افسانے (تھک کر گرتے شوخ پرندے) میں زندگی کے جبر کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ انسان اس دنیا میں چاہے جتنی ترقی کر لے لیکن آخر اس کا انجام موت ہی ہے۔انسان کی تمام تر ترقیوں کے باوجود زندگی میں اسے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت پڑتی ہے ،ورنہ اس کے اندر کا انسان تھک کر گر جاتا ہے ،جس کا نتیجہ موت کی صورت میں آتا ہے۔"شفیق انجم" نے بھی اس افسانے (تھک کر گرتے شوخ پرندے) میں اس موضوع کو زیرِ بحث لا کر انسان اور پرندوں کے درمیان تقابل کرا کر انسانی انا پرستی اور بے پرواہی کو بیان کیا ہے۔پرندوں میں ایک خوبی یہ پائی جاتی ہے کہ اگر ایک پرندہ مر جائے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا لیکن انسان کبھی دوسرے انسان کا سہارا نہیں بنتا بلکہ وہ اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگنے والا گھوڑا بن جاتا ہے۔اس افسانے (تھک کر گرتے شوخ پرندے) کی کہانی کچھ یوں ہے کہ میں (کردار) اور ماں جی ایک دن باہر صحن میں بیٹھے تھے کہ اوپر پہاڑی علاقے سے ایک گاڑی آئی اور وہ ہمارے گھر کے قریب آکر خراب ہو گئی، کوشش کے باوجود گاڑی سٹارٹ نہ ہوئی۔اس میں دوشیزہ تھی جسے ماں گھر لے آئی اور خوب خاطر خواں کی ،اس کے بعد سالوں سال وہ موسم سرما میں جب گرم علاقوں کی طرف جاتی تو ہمارے گھر ضرور آتی۔ میں (کردار) اور لڑکی دل ہی دل میں ایک دوسرے کو چاہنے لگے لیکن کبھی آگے بڑھنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی۔لیکن آخری بار جب وہ آئی تو ماں کو فوت ہوئے مہینوں گزر چکے تھے ،وہ دیر تک روتی رہی اور ماں کو یاد کرتی رہی۔میں نے ہمت کر کے اس سے شادی کے بارے پوچھا تو اس نے نہ میں جواب دیا۔پہلی بار جب وہ ان کے گھر آئی تو اس منظر کو افسانے میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

"کھانے کے بعد میں تو جلدی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا لیکن ماں جی اور وہ دیر تک باتیں کرتی رہیں، خلاف معمول مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ کان آوازوں پر لگے ہوئے تھے اور آنکھوں میں اس کا سراپا نقش تھا۔ نہ جانے خدا نے اسے چاندی سونے سے گوندھ گوندھ بنایا تھا یا کہیں کسی اور دنیا سے دودھیا مٹی میں سینکڑوں ہزاروں چمکیلے رنگ ڈال ڈال نکھارا تھا کہ پہلی ہی نظر میں آنکھیں چندھیا سی گئیں"(۴۳)

اندر ہی اندر سے وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے کی آگ میں جل رہے تھے لیکن نہ جانے کون سا ایسا خوف جو ان کو قریب آنے سے روک رہا تھا۔ جیسے جیسے برف باری کا موسم چلتا تو وہ پہاڑوں سے اتر کر گرم علاقوں کی طرف جاتی اور راستے میں ماں جی کے پاس بھی کچھ وقت گزارتی، اسی طرح یہاں مصنف نے پرندوں کی نقل مکانی کو بھی بیان کیا ہے کہ جب پرندے سردی سے بچنے کے لیے میدانی علاقوں کا رخ کرتے ہیں، تو وہ ڈاروں کی صورت میں ہجرت کرتے ہیں۔ ہر ڈار کا ایک تکونی زاویہ ہوتا ہے اور پرندوں کا ایک اصول ہوتا ہے کہ راستے میں مرنے والے پرندے کی جگہ دوسرا پرندہ لے لیتا ہے، اور سفر کو جاری رکھتے ہیں۔ مصنف نے پرندوں کی ہجرت کو خوبصورت منظر کے ساتھ پیش کیا ہے جو کہ درج ذیل ہے:

"جب جب آسمان سے زہر بجھے، دودھیلے پھول برسنے کا وقت قریب ہوتا تو یہ خاندانوں کے خاندان، جن کی تعداد لاکھوں میں ہوتی ہے، گرم علاقوں کی طرف ہجرت کرنے لگتے ہیں۔ میلوں میل انت بلندیوں پر ہواؤں کو چیرتے ہوئے ان کا سفر دنوں جاری رہتا ہے۔ کڑے سفروں میں ان کو معلوم ہوتا ہے کہ کون سا طریقہ اختیار کرنا ہے، سو یہ ڈاروں کی صورت میں اڑتے ہیں اور ہر ڈار کا اپنا ایک تکونی زاویہ ہوتا ہے"۔(۴۴)

اگلی نوک پر ڈٹ جانے والا پرندہ ہوا کا جبر سہتا ہے اور باقیوں کا سفر آسان بناتا ہے، جب وہ تھکتا ہے تو دوسرا پرندہ آکر اس کی جگہ لیتا ہے۔ اس طرح ان کا سفر آسانی سے کٹتا رہتا ہے۔ مصنف نے اس افسانے (تھک کر گرتے شوخ پرندے) میں انسانوں اور پرندوں کے تقابل سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب ایک ڈار کے سب پرندے مر جاتے ہیں اور کوئی ایک بچ جائے تو بچ جانے والا پرندہ اپنے آپ کو دوسرے ڈار میں مدغم کر دیتا ہے لیکن انسان کبھی ایسا نہیں کرتا۔ اس افسانے میں، میں (کردار) اور وہ خوبصورت لڑکی جو اپنی اپنی ڈار میں اکیلے بچ جاتے ہیں لیکن ایک دوسرے کا سہارا نہیں بنتے جب کہ لڑکا شادی کا پیغام بھی دیتا

ہے لیکن وہ لڑکی قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اپنی بے بسی و تھکی ہوئی زندگی کے باوجود وہ سہارا بننے سے انکار کرتی ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس دیکھیے:

> "جب کبھی کسی ڈار کے سبھی پرندے دم توڑ جاتے ہیں اور کوئی ایک بچ رہتا ہے تو وہ اپنے آپ کو دوسرے ڈاروں میں مدغم کر دیتا ہے۔ یوں اگلی نوک پر رہ کر چھدتے چلے جانے کی بجائے نسبتاً آسانی کے ساتھ سفر جاری رہتا ہے۔ افسوس ہم سے تو ایسا کچھ نہ ہو سکا"۔(۴۵)

شفیق انجم نے اس افسانے (تھک کر گرتے شوخ پرندے) میں زندگی کے جبر کے ساتھ ساتھ پرندوں اور انسانوں کی ترجیحات کو بھی بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کر کے ایک لازول اور شاہکار افسانہ لکھا ہے۔ شفیق انجم جدید افسانہ نگار ہیں اور جدید زندگی کے نمائندہ۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں معاصر زندگی میں حالات کے تغیر و تبدل اور فرد پر اس کے اثرات کو عمیق نظری دیکھایا ہے۔ جہاں فرد جبریت اور تنہائی کی زندگی گزار رہا ہے۔ جدید افسانے کے ایسے رجحان کو ڈاکٹر محمد خاں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> "آج کا فرد اپنے معاشرہ سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا ہے کیوں کہ معاشرہ کی پابندیاں اور قوانین اس کی شخصی آزادی اور انفرادیت کے لئے خطرہ بن گئی ہے ۔ وہ اپنے وجود کا اثبات چاہتا ہے"۔(۴۶)

حاصلِ بحث یہ ہے کہ شفیق انجم نے سماجی جبر کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ جن سے سماج میں انسانی قدر و قیمت اور اس کے تمدنی امور کی وضاحت بخوبی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ بنیادی موضوعات میں جبر و استبداد اور استحصال کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ سماج کی معاصر صورتحال کا نقشہ حقیقی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جبر کی مختلف صورتوں میں ان کے ہاں تقدیری، نفسیاتی اور سماجی جبر نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ جبر کسی ایک فرد سے شروع ہو کر پورے سماج پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جبر کی مختلف صورتوں میں تقدیری جبر اس قدر حاوی ہے کہ ان کے افسانوں کا بنیادی کردار "میں" اپنی ذات سے باہر نکل کر دیکھتا ہے تو اس کے سامنے تقدیر دیوار بن کر کھڑی ہوتی ہے۔ اسی تناظر میں وہ نفسیاتی طور پر بھی متاثر ہوتا ہے۔ جو سماج میں بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سماجی جبر کی مختلف صورتیں بھی اسے متاثر کرتی ہیں۔ ان کے کردار ان تمام متذکرہ مجبوریوں کے حامل نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (جلد دوم)، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، لاہور، طبع دوم ۱۹۷۴، ص ۳۶

۲۔ اشفاق احمد، محمد اکرام چغتائی (مرتبین)، فرہنگ اصطلاحات۔ جلد اول، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۵۴۴

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۴۶۰

۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ – بیسوی صدی کی تحریکوں اور رجحانات کی روشنی میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ص ۲۷۸

۵۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم ۲۰۱۸ء، ص ۸۶۶

۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، اسلوب اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵

۷۔ ایضاً، ص ۱۵

۸۔ ایضاً، ص ۲۳

۹۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۸

۱۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۱ء، ص ۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، روشنی آواز دیتی ہے، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص ۱۱

۱۷۔ سارتر، ادبی دنیا، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۹۵

۱۸۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص ۸۶

۱۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، ص ۶۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۶۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۸۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۲۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، ص ۳۰

۲۴۔ جلیل الرحمان، تہذیبی اساس، جوہر پریس، جوہر آباد، ۱۹۹۵، ص ۳۳

۲۵۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، ص ۴۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۴۳

۲۷۔ ایضاً، ص ۴۳-۴۴

۲۸- ایضاً، ص ۱۱۸

۲۹۔ صبا اکرام، جدید افسانہ-چند صورتیں، فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۲۰۰۱ء، ص ۱۷

۳۰۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ-سیاسی و تاریخی تناظر میں، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۵ء ص ۶۱۶، ۶۱۷

۳۱- شفیق انجم، ڈاکٹر، روشنی آواز دیتی ہے، ص ۲۳

۳۲- ایضاً، ص ۸۰

۳۳- ایضا، ص ۸۳-۸۴

۳۴- شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، ص ۴۰

۳۵- ایضاص ۴۲

۳۶- ایضا، ص ۴۳

۳۷۔ بختیار حسین، وجودیت کیا ہے، راوی، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۱

۳۸- شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، ص ۳۷

۳۹- ایضا، ص ۴۰

۴۰- ایضاً، ص ۸۹

۴۱- ایضا، ص ۹۲

۴۲- ایضا، ص ۹۴

۴۳- ایضاً، ص ۷۷

۴۴- ایضا، ص ۷۹

۴۵- ایضا، ص ۸۲

۴۶۔ محمد خاں، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اشاریت (1960ء کے بعد)، ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۵۶

باب سوم

شفیق انجم کے افسانوں میں تنہائی(Solitude) کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

تنہائی کا انگریزی میں مترادف Soltitude ہے[۱]۔ تنہائی کے لغوی معنی اکیلا ہونا ہے[۲]۔ اصطلاحی طور پر تنہائی سے مراد فرد کا معاصر زندگی سے وابستہ مختلف پہلوؤں سے کنارہ کشی کرنا ہے۔ سماجی ونفسیاتی ہر دو سطح پر فرد خود کو تنہا تصور کرتا ہے۔ اس کے معاملاتِ زندگی میں خاطر خواہ تبدیلی رونما ہو جاتی ہے جس کے اثرات اس کی اپنی ذات اور اس منسلک لوگوں پر پڑتے ہیں۔

معاصر زندگی نے فرد کی مصروفیات بڑھادی ہیں۔ حالات دن بدن بدل رہے ہیں۔ میکانکی ترقی سے انسانی زندگی کی ترجیحات بدل چکی ہیں۔ دنیا گلوبل ویلیج بن چکی ہے۔ انسانوں کی بھیڑ میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ انسان آگے سے آگے جانے کی خواہش میں ہلکان ہو رہا ہے۔ کامیابی کی امنگ نے انسان کی دوڑ میں اضافہ کر دیا ہے۔ آرام حاصل کرنے کے لئے بے آرام ہو رہا ہے۔ لیکن ان حالات میں فرد خود کو تنہائی کے دہانے پر لے جا رہا ہے۔ مشینی زندگی کا انسان روبوٹ بن چکا ہے۔ اس کے ارد گرد کون ہیں، کیا کر رہے ہیں، اسے خبر نہیں ہے۔ اکیلا اپنے کام میں مگن، مست ہو چکا ہے۔ ادبا کی ایک بڑی جماعت نے فرد کے اکلاپے کو اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے جس میں جدید افسانہ نگار بہ طور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ شفیق انجم معاصر ادبا کی طرح اپنے افسانوں میں تنہا زدہ زندگی کی بے رونقی، بے چہرگی اور بے بسی کو نئے انداز میں منظر عام پر لاتے ہیں۔ ڈاکٹر فوزیہ جدید افسانے کے موضوعات اور ان کی وجہ سے تنہائی کے ضمن میں رقمطراز ہیں:

> "مادیت پرستی، ہوس زر، جھوٹ، فریب، بدکاری، طبقاتی تقسیم، ریشہ دوانیاں، مارشل لائی آمریت، نفسا نفسی، ہجوم کے شور و غوغا اور زندگی کی بے معنویت نے فنکار کو اپنے اندر تنہا کرنا شروع کر دیا اور رجائی نقطہ نظر کی بجائے نفی، یاسیت، تشکیک اور الم پرستی کا رجحان پیدا ہوا"۔[۳]

سماجی، سیاسی، ثقافتی صورت حال ہمیشہ افسانوں کا حصہ رہی ہے نائن الیون نے جو حالات پیدا کیے اس کی بدولت نہ صرف دنیا سیاسی طور پر بدلی بلکہ اس نے ہمارے سماج کو بڑی حد تک بدل کر رکھ دیا۔ شفیق انجم کے افسانوں میں اس سانحے کے بعد ہونے والے سماجی تغیر و تبدل کو موضوع بنایا اور اس کے فرد پر اثرات کو نمایاں کیا۔ اس واقعہ کے بعد پوری دنیا میں اس کے اثرات دیکھے گئے ہیں، دہشت گردی کی ایک نئی لہر بھی پیدا ہوئی، پاکستانی سماج میں اس سانحے نے بہت زیادہ تبدیلیاں رونما کیں، شدت پسندی، مذہبی انتہاپسندی، نفرت، خوف، دہشت، جبر و تشدد، تنہائی، بیگانگی نے ہمارے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مصنف نے اسی تناظر میں اپنے افسانوں میں ان حالات اور سماج کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ ایک ایسا عالمگیر سانحہ تھا جس سے متاثر ہوئے بغیر کوئی نہیں رہ سکا۔ خصوصاً پاکستان، افغانستان کے خطے میں جو تغیر و تبدل آیا وہ ہمارے سماج میں واضح دیکھے جا سکتے تھے اور کچھ اثرات ابھی تک ویسے کے ویسے ہیں ہیں۔ پاکستان کی سماجی زندگی بہت زیادہ متاثر ہوئی، اس واقعے کے بعد بننے والی ملکی سیاسی پالیسیوں نے ہمارے ملک پر بہت زیادہ اثرات ڈالے، وہ مذہبی دہشت گردی جو پہلے چند ملکوں تک محدود تھی اس واقعے کے بعد یہ پھیل کر پوری دنیا میں پہنچ گئی، ہر خطہ ہر ملک نے اپنی حفاظت کے اقدامات کرنے شروع کر دیے تھے، اسی طرح پاکستانی سماج بھی اس عالمگیر واقعہ سے متاثر ہوا۔ اس کے رد عمل میں جو اثرات سماج پر مرتب ہوئے اس سے تنہائی اور جبر کو فروغ ملا۔ اس تنہائی زدہ زندگی کو شفیق انجم اپنے افسانوں میں اجاگر کرتے ہیں۔ انہوں نے سماجی، نفسیاتی اور شناختی تناظر میں اس (تنہائی) صورتحال کو بیان کیا ہے۔ ذیل میں تنہائی کی اس صورتحال اور تناظرات کو شفیق انجم کے افسانوں کے حوالے سے پیش کیا جا رہا ہے۔

الف۔ شفیق انجم کے افسانوں میں تنہائی (Soltitude) کے سماجی تناظرات

دور جدید میں سائنسی ترقی کی بدولت دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے۔ مہینوں اور سالوں کا سفر چند گھنٹوں میں ہو رہا ہے۔ ضروریات زندگی کے پیش نظر انسان ایک ملک سے دوسرے ملک جاتا ہے۔ جس سے انسان اپنے خاندان، گھر، اولاد سے دور ہو جاتا ہے۔ ان فاصلوں کی وجہ سے فرد اور گھر والوں کو الگ الگ تنہائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شفیق انجم اپنے افسانے "مٹی بوسہ دیتی ہے" میں ایسی تنہائی کو سامنے لاتے ہیں۔ جہاں فرد اپنوں کو چھوڑ کر بیرون ملک جاتا ہے اور اس کے جانے سے اس کی ماں، بیوی اور بچوں پر کیا گزرتی ہے اور وہ خود بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہے۔

"دروازے کے قریب بیگم، نم آنکھیں لئے کھڑی تھی۔ کہا، ڈاکٹر صاحب آپ جا رہے ہیں، ہمارا کیا بنے گا!!۔۔ میں نے ایک نظر اسے، ایک نظر اپنے بچوں کی طرف دیکھا اور جذبات پر قابو رکھتے ہوئے فقط اتنا ہی کہہ سکا کہ فکر نہ کرو، اللہ بھلی کرے گا"۔ (۴)

شفیق انجم کی کہانیوں میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ ان کی کہانیاں زندگی کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ ہمارے سماج میں بیرون ملک جانے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بالخصوص نئی نسل بیرون ملک تعلیم و معاش کے حصول کی دوڑ میں شامل ہے۔ اس کے برعکس ان کے والدین پر کیا بیتتی ہے اور تنہائی کا خوف کس طرح اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ یہ ان کی کہانیوں میں دکھایا گیا ہے۔

"چلتے وقت ماں جی نے کہا تھا کہ بیٹا دور دیسوں جا رہے ہو تو اپنے کام کی فکر کرنا، ہماری فکر بالکل نہ کرنا۔ ہم جیسے تیسے بھی ہیں ٹھیک ہیں۔ بہت سی گزر چکی، جو رہتی ہے وہ بھی گزر جائے گی"۔ (۵)

مندرجہ بالا اقتباس میں ایسی حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے جس میں انسان بے بس ہے۔ یہ بے بسی اسے تنہائی سے خوفزدہ کرتی ہے۔ ماں اپنے بیٹے کو رخصت تو کر رہی لیکن ساتھ ہی اپنے اکیلے پن کا اظہار بھی کر رہی۔ یہ رویے موجودہ سماج میں بہت تیزی سے فروغ پا رہے ہیں۔ جس سے فرد کی زندگی متاثر ہو رہی ہے۔ اکلاپے نے دن رات کا سکون ختم کر دیا ہے۔

شفیق انجم کے کردار انفرادی و اجتماعی ہر دو سطوح پر تنہائی کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کے ہاں تنہائی کے کئی روپ ہیں۔ سماج میں بے حسی اور بے کسی نے افراد کو ایک کونے میں دھکیل دیا ہے۔ حاکم اور محکوم کی دھکم پیل جاری ہے۔ ظالم و مظلوم کی رسہ کشی ہو رہی ہے۔ ایسی صورتحال میں ایک افراد اجتماعی تنہائی کا شکار نظر آتے ہیں۔ جہاں ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ان کا افسانہ "روشنی آواز دیتی ہے" ایسے طبقے کی عکاس کہانی ہے جس میں جبر ہے۔ اور یہ جبر افراد کے لئے تنہائی کا باعث بنتا ہے۔

"مفتوح باندیاں بچے جن رہی ہیں۔

زور آور اپنی اپنی پسند کے چن چن الگ کرتے باقیوں کی ڈھیری لگاتے جاتے ہیں۔

ڈھیریاں لگتی جاتی ہیں اور اتنی لگتی ہیں کہ زمین بھر جاتی ہے

مضبوط رسے تیار ہوتے اور گٹھڑ باندھ باندھ مندیوں کی طرف ہانکا لگا دیا جاتا ہے"۔(۶)

شفیق انجم سماج کے ہر طبقے کو اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کے افسانے کسی خاص طبقے تک محدود نہیں۔ ماضی سے حال کا سفر کرتے، تاریخ بتاتے ہوئے مستقبل کی پیشن گوئی کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں تسلسل نہیں ہے۔ کبھی ماضی میں جانے کی خواہش امڈ آتی ہے اور کبھی آگے بڑھنے کی۔ ان کا افسانہ "منظر خواب کا سا ہے" میں ایسی ہی صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے، جہاں فرد میں عدم تحفظ اور عدم اطمینان کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

"سچ، تم مجھے ساتھ لے چلو، میرا کوئی حال ہے نہ مستقبل۔۔۔ میں پل پل خوف کی سولی پر لٹکا سسک سسک مرتا اور جیتا ہوں۔ میرا ماضی بھی نہیں۔۔۔ لیکن میں نے سنا کہ ماضی ہوتا ہے، شاید میں اس سے واقف نہیں ہوں۔ تم جانتی ہو گی، یقیناً جانتی ہو گی۔ سو چلو مجھے ماضی کی طرف لے چلو"۔(۷)

سماج میں جب ناانصافی، بددیانتی، عدم مساوات کا عنصر غالب آجائے تو معمولاتِ زندگی کی ترتیب بھی بدل جاتی ہے۔ رواں دواں زندگی کا پہیہ گھوم جاتا ہے، یا رک جاتا ہے۔ فرد یا تو اس معاشرتی بیماریوں کو قبول کر لیتا ہے، یا پھر خود کو تنہا کر لیتا ہے۔ موجودہ دور میں انسان کرب و خوف میں مبتلا ہے۔ وہ سماجی منفی رویوں سے تنگ آچکا ہے۔ ہر طرف اندھیرا، سناٹا اس پر حاوی ہے۔ یہ تمام صورتحال شفیق انجم کے افسانوں میں بہت عمدگی سے دکھائی گئی ہے۔

"اس نے اذیت ناک بے چارگی کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔

وقت تیز تیز گزرا۔۔۔

میرے سامنے بس اندھیرا تھا اور خوف اور تنہائی۔۔۔

اور بے بسی۔۔۔ کریہہ صورت بے بسی"۔(۸)

غم، دکھ اور تکلیفیں انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ نوعیت اور وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن کیفیت وہی رہتی ہے۔ معاشرتی بگاڑ کے تناظر میں ایسے بہت سے واقعات جنم لیتے ہیں جو کرب، اذیت اور

پشیمانی کا باعث بنتے ہیں۔ اس دور میں ہر کوئی کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔ گھریلو مسائل ہوں یا دفتری، کاروباری ہوں یا مذہبی۔ عدم شناخت کا تصور ہو یا عدم حیثیت کا، یہ فرد کو سماج سے کنارہ کرا دیتے ہیں۔ انسان چاہتے ہوئے بھی بھیڑ میں داخل نہیں ہو سکتا۔۔۔ ہر طرف ہو کا عالم نظر آتا ہے۔ فرد تنہائی کی گرفت میں آجاتا ہے۔ شفیق انجم اس بدلتے منظر نامے کو نئی اشکال میں اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں۔ یہ ان کا فن ہے کہ مصنف اور قاری باہم چلتے ہیں۔

"غم۔۔۔
ہڈیوں میں گھس جانے والا غم مجھے دبوچ رہا ہے۔۔۔ بے طرح دبوچ رہا ہے۔
آہ افسوس کہ میرا ہونا نہ ہونا ایک ہے۔"(۹)

ہر سماج کا اپنا دائرہ ہوتا ہے۔ اس کی حدود ہوتی ہیں اور ان حدود کی پابندی فرد پر لازم ہوتی ہے۔ دائرے سے باہر نکلنا اتنا آسان نہیں ہے۔ چاہتے ہوئے بھی انسان ان قیود سے فرار حاصل نہیں کر پاتا۔ آزادی کا پروانہ حاصل نہ ہونے پر دائرے میں تنہا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنا ہم سفر دائرے سے باہر دیکھ چکا ہے اور اس تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ اس کا انجام سوائے اکلاپے کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس تنہا زدہ زندگی کے سفر کو شفیق انجم اپنے افسانے "تھک کر گرتے شوخ پرندے" میں بیان کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں:

"میں جانتا تھا کہ وہ بھی اندر ہی اندر ٹوٹ رہی ہے اور ہر گزرتے سال اس کی تاب و تب میں گھمبیر اداسی کا سایہ مسلسل گہرا ہو رہا ہے لیکن مجھے معلوم تھا وہ اپنے حصاروں سے کبھی باہر نہ نکلے گی۔ میں بھی تو اپنے حصاروں سے باہر نہیں نکل پا رہا تھا۔ شاید ازلوں ازلی دائرے ایسے ہی ہوتے ہیں"۔(۱۰)

شفیق انجم ہر شعبہ ہائے زندگی کو اپنی کہانیوں میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانے ان کے تجربات معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی کہانیاں معاشرتی زندگی کے گہرے مطالعے کے دلائل ہیں۔ انہوں نے گھریلو زندگی سے لے کر کل سماج تک نظر دوڑائی ہے۔ سماج میں فرد مختلف رتبوں، حیثیتوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس تقسیم نے انفرادی و اجتماعی طور پر زندگی کو تنہا کر دیا ہے۔ یہاں قدر دولت، دھن سے ہے۔ عزت مال کی ہے۔ کرسی کی ہے۔ جہاں قدریں اخلاقیات کی بجائے مال و دولت کے عوض ہوں وہاں غریب طبقہ پِس جاتا

ہے۔ جبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے ساتھ کے لوگوں سے دانستہ طور پر الگ کر دیا جاتا ہے۔ کم تر کی بنیاد پر۔ یہ تفریق شفیق انجم کے افسانوں میں نہایت خوبصورتی سے بیان کی گئی ہے۔ " دنیا دکھ ہے " اسی صورتحال کا عکاس افسانہ ہے جس میں دیہی سماج کی عکاسی کی گئی ہے۔ جاگیر دار اور مزارع کا فرق۔ امیر اور غریب کا فرق۔ اونچ اور نیچ کا فرق۔ وہ لکھتے ہیں کہ " گھر گھاٹ تو بن جائے گا خالہ، مگر شادی !! " وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتا۔ " فضل دین مزارع کے بیٹے کو اپنی بیٹی کون دے گا؟ "۔(۱۱)

'دنیا دکھ ہے' معاشرتی بے راہ روی اور بگاڑ کی عمدہ مثال ہے۔ جہاں ایک مزارع کا بیٹا، پڑھ لکھ جانے کے باوجود بھی اپنا رتبہ اونچا نہیں کر سکتا، کیوں کہ وہ ایک مزارع کا بیٹا ہے۔ اسے اس بات کا شعور ہے کہ سماج میں ان کی حیثیت کیا ہے؟ لیکن اس کی ماں اس امید پر تھی کہ اسے بیٹے کے لئے اچھا رشتہ مل جائے گا۔ لیکن سماجی تقسیم نے ماں کی امیدوں کو ہوا میں اڑا دیا۔ انہیں احساس ہوا کہ انسانوں کے اس ہجوم میں وہ تنہا ہیں۔ یہاں ان کے ساتھ کوئی نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> " اور پھر ایک دن اس نے سنا کہ مضطرب ماں سے رہا نہیں گیا۔ وہ ڈیوڑھی ڈیوڑھی گھوم آئی۔ اس نے سنا۔۔۔ آگے بہت کچھ تھا سننے کو اور بتانے والا بتاتا رہا مگر یہ سب کچھ تو وہ بہت پہلے سے جانتا تھا۔ سو اس نے سنی آدھی بات بات اور اندر ہی اندر تڑخا، تیز تیز تڑخا۔ دراڑیں شگاف بنیں، شگاف خندق ہوئے اور راکھ اور دھول اور دھواں پھیلتا گیا "۔(۱۲)

اس تنہا زدہ زندگی نے فرد کو کرب، درد اور تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ ایسے حصار میں بند ہے جس کو وہ توڑ نہیں سکتا۔ سوائے دم گھٹنے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ یہ معاشرتی رویے فرد کی زندگی پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ ان رویوں کو شفیق انجم اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں جس سے فرد تنہائی کا شکار ہے۔ ان کے ہاں وجودی موضوعات تواتر کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ شفیق انجم کی کہانیاں محبت کی کہانیاں ہیں، نفرت کی کہانیاں ہیں۔ سسکتی بلکتی، آہیں بھرتی، چیختی چلاتی، تڑپتی تڑپاتی وجودی مجسمے کی کہانیاں ہیں۔ وہ رخصت ہوتی زندگی پر آہ و بقا کرتی، سر پیٹتی، بین کرتی محبت کو تنہا چھوڑنے کی عکاس کہانیاں ہیں۔ دو محبت کرنے والوں میں ایک ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے والا ہو تو تنہائی کا خوف باہیں پھیلائے کھڑا ہوتا ہے۔ ان کا

افسانہ "چپ چاپ چلے سودائی۔۔۔ہُو" محبت کی لازوال کہانی ہے۔ جس میں بچھڑنے کے نتیجے میں تنہائی کا خوف ہے۔ ہمہ وقت اکٹھے رہنے کے وعدے ختم ہوتے جارہے ہیں۔ پھر کیا ہو گا، صرف تنہائی۔

"دو قوسوں کے درمیان کا فاصلہ کچھ دیر مزید کم ہو گیا۔ تم ایسے سدھرنے کے نہیں، تمھارے ساتھ کوئی اینکی پھینکی کرنا ہی پڑے گی۔ سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔ تم نے تو ہمیشہ ساتھ رہنے کے وعدے کئے تھے۔ اب کیا ہوئے وہ سب۔ ساتھ دینا پڑے گا تمہیں۔ سنا تم نے۔۔۔ساتھ دینا پڑے گا"۔(۱۳)

شفیق انجم فرد کی خارجی و داخلی زندگی کا پرت در پرت مشاہدہ کرتے ہیں۔ علامتوں اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کا افسانہ "بن لفظوں کے کہا سُنا" اتار چڑھاؤ کی کہانی ہے جہاں اضطراب اور سکون کی ملی جلی کیفیات ملتی ہیں۔ فرد خود کو تنہا بھی کر لیتا ہے اور بھیڑ میں گم بھی۔ اکیلے رہ کر ہلکان بھی ہوتا ہے اور پھر راحت بھی میسر آتی ہے۔ اس گہما گہمی کو وہ خاص طور پر اپنی کہانیوں میں سامنے لاتے ہیں۔ بند کمرے میں تنہا بیٹھے نوجوان کی کیفیات کو وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

"ہفتے بھر کے بعد آج پھر وہ چپ چاپ نہا دھو کر اپنے کمرے میں گھسا رہا۔ باہر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ عجب سی سوچیں سارا دن دندناتی رہیں مگر پہلے کی نسبت خوف بہت کم تھا اور کیف و سرشاری زیادہ۔ بار بار مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل جاتی، آنکھوں میں شوخی سی اتر آتی اور وہ تپتے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے سہلانے لگتا"۔(۱۴)

شفیق انجم کے کرداروں کے کئی روپ ہیں۔ ان کے کام انوکھے ہیں۔ قاری کو اپنے حصار میں لیتے ہیں اور ساتھ ہی اڈاری مار کر کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی خود کردار بن جاتا ہے اور کبھی کوئی اور۔ یہ بدلتے رنگ، بدلتے ڈھنگ سماجی رویوں کے عکاس ہیں۔ سیدھی سپاٹ کہانی جاتے جاتے پلٹ جاتی ہے اور اندھیری غار سے ہوتی ہوئی واپس آجاتی ہے۔

"خدا حافظ کہنے سے پہلے پہلے اس کے بارے میں جو تفصیل معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اس کا نام الف ہے، وہ ج کے دفتر میں کام کرتا ہے اور د کے پلازے میں کمرہ نمبر دو سو گیارہ میں رہتا ہے۔ اس نے شادی نہیں کی اس لئے اکیلا ہے۔ وہ دوست نہیں بناتا اس لئے خوش ہے۔ یہ شہر اس کے لئے اجنبی ہے باوجود اس کے کہ وہ یہیں پلا بڑھا اور جوان ہوا

ہے۔ والدین اور بھائی بہن کہاں ہیں اسے کچھ پتا نہیں اور ان کے بارے میں جاننا بھی نہیں چاہتا"(۱۵)

مندرجہ بالا اقتباس سماجی دوری کی عمدہ مثال ہے۔ جہاں فرد ہر رشتے ناطے سے لاتعلق ہو چکا ہے۔ مشین ہے۔ کام کرتا جارہا ہے۔ اس کا اپنا کون ہے اور پرایا کون، اس سے ناآشنا ہے۔ اس کا کام کمانا ہے۔ بس۔ دورِ حاضر کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ انسان جذبات سے عاری ہو چکا ہے۔ مشینی ماحول نے اسے بے بس کر دیا ہے۔ وہ اپنے والدین، بہن بھائیوں، دوست احباب سے کوسوں دور جاچکا ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ کسی اور کا سوچے۔ یہ تنہائی اس پر حاوی ہو رہی ہے۔ اس کے آس پاس کون ہے، اس کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ شفیق انجم نے ایسی بے بسی اور تنہائی کی بہترین عکاسی کی ہے۔ یہ تنہائی اس سے سب کچھ چھین چکی ہے۔ ان کا افسانہ "چلمنوں کے اس پار" میں فرد کی زندگی کو درجہ بدرجہ دکھایا گیا ہے۔ اور اس وقت کی عکاسی کی گئی ہے جس میں سوائے تنہائی کے کچھ نہیں۔ رنگینیاں، خوشیاں، قہقہے سب ختم ہو چکے اور ان کی جگہ وہم، وسوسے، تنہائی نے لے لی۔ وہ لکھتے ہیں:

"وقت کا پنچھی ان حدوں سے باہر نکلا تو رفتہ رفتہ روشنیاں تھرتھرانے لگیں۔ کسی کی گود سے نکل کر تنہا سونے جاگنے کے مرحلے طے ہوتے گئے۔ رسیلے خوابوں کی سوندھی سوندھی خوشبو نے اندھیروں سے اپنائیت کی راہ ہموار کر دی۔ آنکھوں میں برسوں سے روشنی بن کر چمکنے والوں سے وحشت سی ہونے لگی۔"(۱۶)

خارجی حالات کو شفیق انجم نہایت عمیق نظری سے دیکھتے ہیں۔ فرد کی کلبلاتی زندگی کو اپنی کہانیوں میں عمدگی سے عیاں کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں عملی مشاہدے کی مشقیں معلوم ہوتی ہیں۔ معاصر زندگی میں سماجی بے حسی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ فرد کی خیر خبر لینے والا کوئی نہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی دھن میں مگن ہے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں۔ پڑوسی کو پڑوسی کی خبر نہیں۔ ہر طرف اکلاپا۔

"کسی نے مجھے اٹھا کر ہسپتال بھی نہیں پہنچایا، وہاں تو بہت سارے لوگ جمع تھے۔ ایک عام سا واقعہ

لوگ!!۔۔۔ لوگ اپنی ماں کے جائے تھوڑی تھے۔ ہوتے بھی تو کون سا۔۔۔۔!!

آہ بہت تکلیف ہو رہی ہے۔۔۔۔۔بہت زیادہ"۔(۱۷)

مندرجہ بالا اقتباس ان کے افسانہ "ایک عام سا واقعہ" سے لیا گیا ہے۔ یہ افسانہ دور حاضر کی اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے جس میں فرد دوسرے فرد کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنے دکھ اور تکلیف کا خود ذمہ دار ہے۔ سماج میں ہمدردی کا عنصر ختم ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا انسان سے اعتبار بھی جاتا رہا ہے۔ صرف مقصد تک تعلقات ہیں۔ انسانی اقدار کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔ ایسے ہی زندگی کا ایک پرتو شفیق انجم "دنیا دکھ ہے" میں دکھاتے ہیں۔ جہاں فرد کی محنت، اس کی تعلیم، ڈگریاں کسی کام نہیں آتی۔ سفارشی طبقے کی اجارہ داری ہے۔ جہاں محنت کا کوئی عمل دخل نہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا حساب ہے۔ ہر ادارے میں اسی طبقے کی اجارہ داری پائی جاتی ہے۔

> "چند دن گزرے تھے کہ تلخ راتوں میں سے ایک رات اس نے دیکھا اپنے آپ اپنے اوپر تھوکتے ہوئے۔ اسی منظر میں سے منظر ابھرتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک باری باری آگے بڑھتا ہے اور اس پر تھوکتا ہے۔ کوئی ساتھ طمانچہ بھی رسید کرتا ہے"۔(۱۸)

سماجی اداروں کی پسماندگی کی تصویر مندرجہ بالا اقتباس میں دکھائی گئی ہے۔ جہاں اہل افراد کو موقع نہیں دیا جاتا ہے اور نااہل لوگ اپنے اثر و رسوخ سے براجمان ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف بے بسی، تنہائی اور کرب کی صورتحال ہے۔

ب۔ شفیق انجم کے افسانوں میں تنہائی (Soltitude) کے نفسیاتی تناظرات

فرد خارج کے ساتھ داخل سے بھی نبرد آزما ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات نے انسان کے داخل پر مشاہدات کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کے اندر ایک بڑا جہان موجود ہے۔ جس کا براہ راست اثر فرد کی زندگی پر پڑتا ہے۔ معاصر زندگی میں فرد خارجی مسائل سے دوچار ہے، یہی مسائل اس کے اندر تک سرایت کر جاتے ہیں۔ جس سے فرد خود کو خارجی دنیا سے کنارہ کش کر لیتا ہے۔ اندورنی گھٹن بڑھ جاتی ہے۔ اندرونی بوکھلاہٹ نے فرد کو ذہنی معذور بنا دیا ہے۔ شفیق انجم فرد کی داخلی کیفیات کو اپنے افسانوں میں اجاگر کرتے

ہیں۔ انہوں نے فرد کی تنہائی کے نفسیاتی عوامل کو بہ طور خاص موضوع بنایا ہے۔ "دیمک زدہ کھنڈر آس" میں ایسی تنہائی کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> "اداسی پھن پھیلائے چاروں اور گھوم رہی ہے ۔ گہرے سناٹوں میں پھنکارتی پژمردہ چاپ، لرزتے سائے اور مسلسل مدھم ہوتے کچھ بوسیدہ نقش۔ دروازے بند ہیں۔ بالکل بند، اور اندر شاید کوئی بھی نہیں۔ باہر گلی بھی سنسان ہے اور بارش ایسی تیز کہ سب کچھ بہالے جائے گی"۔(۱۹)

مندرجہ بالا اقتباس میں فرد کی غمگین زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ فرد بوکھلاہٹ کا شکار ہے۔ اپنے ارد گرد کا ماحول اس پر اثر انداز نہیں ہو رہا۔ تنہائی کا شکار ہے۔ اندر باہر اکیلا پن محسوس ہو رہا ہے۔ زندگی کی رونق ختم ہو چکی ہے۔ آنسو ہی آنسو ہیں۔ خود کلامی ہے۔ شفیق انجم فرد کی ایسی کیفیت کو سامنے لانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تنہائی اور آنسو کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے فرد کی ایسی زندگی کو کھنڈر کا درجہ دیا ہے جو اس افسانے کے موضوع سے واضح ہوتا ہے۔

> "سناٹوں میں دلدوز چیخیں بڑی ہولناک ہوا کرتی ہیں۔ وہ جانتا تھا، خوب جانتا تھا سو اندر کی آگ باہر نہ نکلی اور وہ روتا رہا۔ پتھر پتھر نہ رہے پگھل پگھل پانی بن گئے اور کیا ہی مضبوط فصیلیں تھیں کہ آن کی آن میں تنکوں کی طرح بہہ گئیں۔ کرب اندر اندر جھکڑ بن کر دندناتا رہا اور سارے منظر دھنکی ہوئی روئی کے گالے بن کر ہوا ہوتے رہے"۔(۲۰)

"میں کون ہوں" میں شفیق انجم فرد کی کلبلاتی زندگی کو نمایاں کرتے ہیں۔ جہاں فرد بے بسی اور تنہائی کے محور میں گھوم رہا ہے۔ جب خارجی مسائل بڑھ جائیں تو فرد کی بے بسی اسے اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے سماجی ماحول نے انسانی نفسیات کو بھی متاثر کیا ہے۔ جب فرد کی اذیت اور کرب بڑھ جاتا ہے تو اسے اپنے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا ذہن کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ جسمانی و ذہنی مفلوجیت کو تقویت ملتی ہے۔ جس سے انسان خود کو ایک دائرے میں مقید کر لیتا ہے۔ یہ قید اس کی اپنی تجویز کردہ سزا ہے۔ جو پل پل اسے جھیلنی پڑتی ہے۔ شفیق انجم اپنے افسانوں میں فرد کی ایسی صورتحال کو اپنا موضوع بناتے ہیں، جہاں رونا دھونا، درد، چیخیں فرد پر حاوی ہوتی رہتی ہیں۔

"قبیح لفظوں کی گرانی نے اندر ہی اندر اودھم مچار کھا تھا، راہ پاتے ہی ابل ابل کر باہر آنے لگے اور وہ دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔۔۔ میں ۔۔۔ میں گندی نالی کا گٹر ہوں، گندگی کا ڈھیر ہوں، گوبر کی بوہوں، ٹھہرا ہوا غلیظ پانی ہوں، سڑی ہوئی بدبودار مٹی ہوں، کچرے سے جلنے والی آگ ہوں، خبیث چڑیلوں کے پیٹ سے نکلتی بو ہوں۔۔۔ وہ چیختا رہا اور دیر تک اس کی یہی حالت رہی کہ لفظوں کی قے منہ بھر بھر کے خود اپنے ہی بدن پر اگلتا رہا"۔ (۲۱)

فرد جب مسائل میں گھر جاتا ہے تو اسے ہر طرف سناٹا دکھائی دیتا ہے۔ سماجی بے راہ روی سے پیدا ہونے والا جبر فرد کے لئے داخلی کرب کا باعث بنتا ہے۔ یہ کربناکی داخلی سطح پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے تنہائی جنم لیتی ہے۔ انسان خود کو بھرے سماج میں اکیلا تصور کرتا ہے۔ یہ اکلاپا اسے اپنے ہونے نہ ہونے کے احساس محرومی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ محرومی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ خود کو کمتر سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسی کیفیت کو شفیق انجم نے علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر اقتباس میں، گٹر، بو، گوبر وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں طبقاتی تقسیم نے فرد کو فرد سے دور کر دیا ہے۔ یہ دوری اس قدر بڑھ چکی ہے کہ ایک طبقہ دوسرے طبقے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح انفرادی و اجتماعی تنہائی کی صورتحال جنم لیتی ہے۔ جسے شفیق انجم اپنے افسانوں میں خوبصورتی سے اجاگر کرتے ہیں۔

" اور جب اس عالم میں کچھ وقت گزرا تو گمان غالب آیا کہ میں شاید ہوں بھی اور نہیں بھی۔

نہیں ہوں تو پھر یہ لمحہ لمحہ مجھ پر کھُلتا بکھیڑا کیا ہے؟ اور اگر ہوں تو اس ہونے کی دلیل کیا ہے؟

میرے ہونے کی آخری دلیل کیا ہے؟"۔ (۲۲)

فرد کی شناخت کا مسئلہ شفیق انجم کے افسانوں کا خاص موضوع رہا ہے۔ شناخت کا تعلق صرف وجود سے نہیں بلکہ اس کی زندگی کے ہر پہلو سے ہے۔ فرد کس طرح خود کو بے نام کر چکا ہے۔ اور خارجی و داخلی حالات و واقعات کس حد تک فرد کی گمنامی کا باعث بنتے ہیں، ان کے افسانوں میں بیان کیا گیا ہے۔ فرد

بوکھلاہٹ کا شکار ہے۔ اسے اپنی ذات گم ہوتی نظر آتی ہے۔ ایسی ہی صورتحال ان کے افسانہ "اپنے لئے ایک نوحہ" میں نظر آتی ہے۔

> "میں عمارت کو ایک بار پھر خوب خوب غور سے دیکھتا ہوں اور اپنے آپ پر نظر کرتا ہوں۔۔۔ مجھے اپنا آپ اجنبی سا لگتا ہے۔ اس عمارت میں میَں اجنبی ہوں۔"(۲۳)

مندرجہ بالا اقتباس فرد کی داخلی کیفیت سے پردہ اٹھاتا ہے۔ جہاں فرد اجنبیت کے احساس میں مبتلا ہے۔ لوگوں کے اندر ہونے کے باوجود بھی اجنبی ہونا، اس کے خارج اور داخل کے ٹکراؤ کی وجہ سے ہے۔ سماجی افراتفری نے فرد کو غمناک بنادیا ہے۔ گھریلو مسائل، دفتری مسائل، معاشی مسائل دن بدن بڑھ رہے ہیں۔ جس کا اثر براہِ راست انسان کی نفسیات پر ہو رہا ہے۔ آئے روز بدلتے حالات سے زندگی کی تلخیاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ جس سے فرد خود کو اجنبی یعنی اکیلے پن میں مبتلا کر لیتا ہے۔ ہجوم میں بھی تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں فرد کا خود پر اختیار ختم ہو جاتا ہے۔

> "جس کے ارد گرد دور تک اندھیروں کا سمندر ہے۔ میں اس کرن کو کہاں کہاں رکھوں، قریب جاتا ہوں تو مجھے نگل لیتی ہے۔ دور جاتا ہوں تو اندھیروں کا لقمہ بن جاتا ہوں۔ خود کو ڈھونڈوں تو کہاں!! سوچ کی روشنی بھی مجھے کچھ نہ دے سکی اور اندھیرا تو ہے ہی اندھیرا"۔(۲۴)

داخل کا کھوکھلا پن باہر کے حسیں ماحول کو بھی دھندلا کر دیتا ہے۔ روشنی روشنی نہیں رہتی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ مایوسی فرد کو گھیر لیتی ہے۔ افسانہ "کہو۔۔۔ کہو میری جان" اسی کشمکش کا پرتو ہے۔ جس میں شفیق انجم فرد کی تاریک زدہ صورتحال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جہاں ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس ناکام زندگی نے فرد کو تنہائی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ جس سے ماحول میں عدم سکون کا سماں پیدا ہو چکا ہے۔ انہوں نے ذہنی الجھن کو بہت خوبصورتی سے اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔ یہ اکلاپا فرد کو خود کلامی تک لے جاتا ہے۔ جہاں خیالات کی دنیا سامنے آتی ہے۔ خیالات میں فرد کی تسکین ہوتی ہے لیکن جونہی یہ حصار ٹوٹتا ہے، وہی تنہائی منتظر ہوتی ہے۔ بانہیں کھول کے۔ شفیق انجم ایسے نباض افسانہ نگار ہیں کہ فرد کی داخلی تہہ تک پہنچنے کی جسارت رکھتے ہیں۔ اور ان کیفیات کو باہر اچھال پھینکتے ہیں۔

"میں نے اسے دیکھا حجاب و بے حجابی میں، اور سجنے سنورنے میں، اور منظروں میں اتر کر منظر ہونے میں۔ اور یہ جانا کہ جھیل کنارے اونچائیوں پر بنے اس بادبانی جہاز نما گھر میں اور اس کمرے میں اور اس کے قریب کے سائے میں اور اسے مَس کر کر گزرتے لمحوں کے بہاؤ میں۔۔۔ تفہیم کا عمل کچھ اور ہی اور ہے۔

میں وہاں تھا۔۔

میں وہاں رہا ساری رات اور اسے دیکھتا رہا ساری رات۔ اور رات بیت گئی۔ اور یقیناً اس بات کی اسے قطعاً کوئی خبر نہیں"۔(۲۵)

ماہر نفسیات فرد کی تنہائی اور احساس تنہائی کو الگ الگ بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے فرد کے احساس تنہائی پر زور دیا ہے۔ کہ انسان محفل یا بھیڑ میں بھی یہ سوچتا ہے کہ اس کا یہاں ہونا اور نا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کی موجودگی سے کسی کو کوئی فرق نہیں اور نہ ہی وہ کسی کا منظورِ نظر ہے۔ یہ احساس تنہائی اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگتا ہے۔ یہی احساس شفیق انجم کے افسانوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ جو کبھی خود کلامی کی صورت میں واضح ہوتا ہے تو کبھی منظر میں۔ اور کبھی کرداروں کے رویوں میں یہ احساس دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"ڈیپریشن کی زیادتی کے باعث فرد تنہائی پسند ہو جاتا ہے جو دیگر افراد سے صحت مند سماجی روابط کی استواری میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ یہ تنہائی جب کنویں کی صورت اختیار کر کے فرد کو صرف اپنی ذات کا اسیر بنا دیتی ہے تو پھر اس کے لئے اس "چاہ ذات" سے باہر نکلنا دوبھر ہو جاتا ہے"۔(۲۶)

دورِ حاضر کربناک دور ہے۔ تکلیف اور تنہائی نے انسانی روح کو مجروح کر دیا ہے۔ بناوٹی چہروں نے اصل چہروں کو مسخ دیا ہے، انسان انسان سے دور بھاگ رہا ہے۔ مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ اس دردناک دور میں فرد اندر کی دنیا میں مسکن بنا رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ خارجی عوامل سے نبرد آزما ہونا اب اس کے بس کی بات نہین رہی۔ آئے روز کئی نئے مسائل جنم لے رہے ہیں۔ بظاہر آزادی ہے، کھلی فضا ہے لیکن

اندر قیدِ تنہائی ہے، اندھیرا ہے، سناٹا ہے۔ سماجی رویوں نے انسان کو بے بس بنا دیا ہے۔ گھپ اندھیری کھائی میں گرا دیا ہے۔ یہی صورتحال شفیق انجم کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہے۔

"جانتے ہو تم کہاں ہو؟

۔۔۔ نہیں جانتے؟

گٹر میں۔۔۔ تم گٹر میں ہو اور یہی گٹر تمھارا مقدر ہے، یہیں سڑو مڑو گے۔

لیکن گٹر میں سانحات تو نہیں ہوتے !!۔۔۔ گٹر میں ہونا بذات خود ایک بڑا سانحہ ہے"۔(۲۷)

شفیق انجم فرد کے لاشعور میں دبے واقعات کو اور ان کے اثرات کو بہ خوبی اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔ وہ معاصر زندگی اور اس سے منسلک مسائل کو لاشعور سے تحت الشعور پر کامیابی سے لاتے ہیں۔ فرد کی بکھرتی زندگی اور اندر کی تاریکی ان کے خاص موضوع بنتے ہیں۔ جہاں فرد کی تنہائی اسے کاٹ کھانے کی منتظر ہے۔ یہ اکیلا پن اسے زندگی کی رنگینوں سے دور لے جاتا ہے۔ دور حاضر مشینی دور تصور کیا جاتا ہے جس میں فرد کی زندگی مشینی ہو چکی ہے۔ اپنوں سے دوری نے فرد اور خاندان کو الگ الگ تنہائی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کا اثر خارج سے داخل تک سرایت کر چکا ہے۔ اندر کی ٹوٹ پھوٹ تنہائی کا باعث بنتی ہے۔ خارج اور داخل کے تصادم میں پیدا ہونے والی تنہائی کو شفیق انجم "دیمک زدہ کھنڈر آس" میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

"باہر کہ جہاں روشنی نے چہروں کو پہچان دے دی تھی۔ خونخوار چہرے، غراتے ہوئے ایک دوسرے پر پل پڑنے کو بے قرار۔ زرا زرا سی بات پر آپے سے باہر ہوتے ہوئے۔ اندر اندھیرا تھا۔ تنہائی تھی۔ سناٹا تھا"۔(۲۸)

ان کے ہاں وجودی موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ جس میں تنہائی ان کا محبوب موضوع ہے۔ مصنف اپنے فن سے قاری کو دور نہیں ہونے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں قاری کو اپنی آپ بیتیاں محسوس ہوتی ہیں۔ اندھیرے اور تاریکی کو انہوں نے تنہائی اور احساسِ تنہائی کے لئے استعمال کیا ہے۔ جہاں روشنی کے باوجود تاریکی ہے۔ جہاں شور کے باوجود سناٹا ہے۔ اجاڑ پن اور درد نے فرد کو مفلوج کر دیا ہے۔ زندگی کی درجہ بدرجہ پسماندگی کو انہوں نے بہ خوبی بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کئی موضوعات ایک ساتھ چلتے ہیں۔

مایوسی فرد کو گھیرے ہوئے ہے۔ گھر، باہر سب اس سے دور ہیں۔ ان میں اسے اپنا پن غائب ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ ناکامی اور بے بسی نے اس کے ذہن کو سُن کر دیا ہے۔ "چلمنوں کے اس پار" میں ایسی کیفیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

> "میں دیکھتا ہوں، ایک ایک نقش کو آنکھوں میں جذب کرتا ہوں۔ مگر اندھیرا ہے۔ کوئی بھی تو نقش ایسا نہیں کہ روشنی بن کر جھلملائے، کچھ دیر کے لئے حلقۂ چشم میں جگمگائے تو اطمینان ہو کہ میں دیکھتا ہوں، مگر ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ دکھنے والے کہتے ہیں روشنی ہے، نور ہے، رنگا رنگی ہے، خوبصورتی ہے۔۔۔ ہو گا۔۔۔ شاید ایسا ہی ہو گا لیکن میرے ہاں تو سب اندھیرا ہے۔۔۔ سب اندھیرا"۔ (۲۹)

ذہنی دباؤ کی وجہ سے فرد کی قوتِ ارادی کمزور ہو جاتی ہے۔ خواب، واہمے اور وسوسے بڑھ جاتے ہیں۔ سیدھا جاتے جاتے کسی اور جگہ پلٹ ہو جاتی ہے۔ چیزیں سامنے ہونے کے باوجود نظر نہیں آتیں۔ ذہنی تازگی نہ ہونا ایک بڑی بیماری ہے۔ اس کی وجہ سے انسان خود کو دوسروں سے الگ تھلگ کرنے لگتا ہے۔ اسے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کا مقصد ختم ہو چکا ہے۔ تنہا رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ کھانے کی میز پر بھی دوسروں کے ساتھ ہو کر بھی لاعلم رہتا ہے۔ نفسیاتی دباؤ اسے ہر کسی سے الگ کر دیتا ہے۔

> "وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔۔۔ سوچتا رہا آنے والے کل کے بارے میں اور وہ سوچتا رہا گزرے ہوئے کل کے بارے میں، مگر سب کچھ الجھ سا گیا تھا، ترتیب الٹ پلٹ سی ہو گئی تھی اور وہ بھول بھلیوں میں گھومے چلا گیا"۔ (۳۰)

مندرجہ بالا اقتباس میں انہوں نے ذہنی کشمکش کی عکاسی کی ہے۔ جہاں فرد تذبذب کا شکار ہے۔ کوئی بھی سمت درست نہیں ہے۔ ایک طرف جاتے جاتے دوسری طرف مڑ جاتا ہے۔ کسی ایک زمانے میں ذہن نہیں ٹھہرتا، کبھی حال، ماضی اور مستقبل میں گھوم رہا ہے۔ نہ زماں کی خبر ہے اور نہ مکاں کی۔ یہ کشمکش اس کے اکلاپے کی دلیل ہے۔ تنہائی نے فرد کو اپنے حصار میں لیا ہوا ہے۔ جس سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔ شفیق انجم فرد کی نفسیاتی تہہ تک پہنچ کر کہانی لکھتے ہیں۔ وہ مکھوٹا ہٹا کر اصل چہرے کو سامنے لاتے ہیں۔ شفیق انجم کا افسانہ "خدا مصروف ہے" جدید دور کی زندگی میں انسان دشمنی کی عمدہ مثال ہے۔ جس کے نتیجے میں قومی و بین الاقوامی ہتھیاروں اور مار دھاڑ کی دوڑ بڑھ رہی ہے۔ جدید ہتھیار انسان کو ختم کرنے کے لئے استعمال ہو

رہے ہیں۔ اس افسانے میں فرد خود کو نفسیاتی طور پر تنہا تصور کرتا ہے۔ جہاں اس کا پُرسانِ حال کوئی نہیں۔ انجانی موت کا خوف طاری ہے۔

"بڑے تصادم کی تیاریاں مکمل ہیں اور افواہ یہی ہے کہ خدا مر چکا ہے۔۔۔ یا شاید سو رہا ہے یا مایوس ہے یا تھک گیا ہے۔۔۔ یا شاید مصروف ہے۔۔۔ بہت مصروف"۔ (۳۱)

شفیق انجم نے اپنے تینوں افسانوی مجموعوں میں فرد کے وجودی عناصر کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ زندگی اور اس کی تلخیوں کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ فرد کی نفسیات کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انسان کے اندر کی دنیا شفیق انجم سے مخفی نہیں، وہ اس میں غوطہ زن ہو کر باہر نکلتے ہیں اور اپنے ساتھ اندر کا ایکسرے کر کے نکلتے ہیں۔ معاصر زندگی میں فرد کس قدر نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہے، ان کے افسانوں میں واضح نظر آتا ہے۔

انہوں نے تنہائی اور احساسِ تنہائی کو اپنی کہانیوں کا خاص موضوع بنایا ہے، جس سے فرد کی زندگی بوکھلاہٹ کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے فرد معاشرے سے دوری چاہتا ہے۔ خود کو الگ تھلگ کرنے کا خواہاں ہے۔ یہ مسئلہ آئے روز بڑھ رہا ہے۔ فرد اندر ہی اندر خود کو دبا رہا ہے۔ گھٹن اور دباؤ میں دن بدن کے اضافے نے انسان کو لاغر اور کمزور کر دیا ہے۔ تنہائی انسان کو اندر سے کھوکھلا کر رہی ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں کو ختم کر رہی ہے۔ قوت ارادی پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ احساس تنہائی اس قدر بڑھ چکا ہے کہ ساتھ رہنے والوں کی بھی کوئی خبر نہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ شفیق انجم جدید دور کے لکھاری ہیں۔ جدید زندگی اور اس سے وابستہ مسائل ان کے موضوع بنتے ہیں۔ جدید کے ساتھ وہ روایت کو بھی نہیں بھولتے۔ ان کے ہاں فرد کی اہمیت مسلم ہے۔

ج۔ شفیق انجم کے افسانوں میں تنہائی (Soltitude) کے ادبی / شناختی تناظرات

شفیق انجم کے افسانوں میں شناخت اور عدم شناخت کا موضوع مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے دیکھیں تو ان کے افسانوں میں شناختی بحران کا پیدا ہونا، سماجی بد نظمی، سیاسی انتشار اور اقتصادی و معاشی ناانصافیوں کی بدولت ہے۔ یہ بحران اتنا وسیع اور گہرا ہوتا چلا گیا کہ خارجی ماحول سے انسان کی ذات میں اتر گیا۔ جس نے انسان کو اپنی ذات اور شناخت کے بحران سے دوچار کر دیا۔ انسانی ذات کے بحران سے

انسان نے شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی اقدار اور روایات پامال کرنا شروع کر دیں۔ جس کی وجہ سے ثقافتی بحران بھی پنپنا شروع ہو گیا۔ لیکن ثقافتی بحران کی صرف یہی وجہ نہیں ہے بلکہ وہ عالم گیر صورتحال ہے جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ جس نے انسان کی معاشرتی زندگی، سیاسی معاملات، ثقافتی خدو خال، حتی کہ ادبی منہاجات بھی تبدیل کر دی ہیں۔ جدید دور میں عالمگیریت کے نام پر ثقافتوں کی پامالی نے انسان کو تنہا کر دیا ہے۔ جس سے اس کی اپنی شناخت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ شفیق انجم نے اس حوالے سے کئی افسانے تحریر کیے ہیں جس میں انسان اپنی شناخت اور عدم شناخت سے دوچار نظر آتا ہے۔ ایسی صورت حال کے ضمن میں صبا اکرام لکھتے ہیں:

> "بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی نے آدمی کے تجربات میں اس قدر تنوع پیدا کیا کہ اس کی یاداشت انہیں اپنی گرفت میں لینے سے ناکام ہو گئی۔ لہذا ہر آج رفتہ رفتہ اپنے گزرے ہوئے کل سے بچھڑتا گیا اور نتیجے کے طور پر صنعتی معاشرے کا آدمی اپنی پہچان سے دور ہو گیا"۔ (۳۲)

انہوں نے اپنے افسانوں میں تاریخی اعتبار سے تہذیبوں کا ارتقاء اجاگر کیا ہے۔ اور جدید دور کی ٹیکنالوجی اور علم کی جو صورتحال پیش کی ہے اس سے انسانی عدم شناخت کو اجاگر کیا ہے۔ ٹیکنالوجی کے استعمال سے ثقافتی سطح پر کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور انٹرنیٹ یا ڈیجیٹل ڈیوائسز نے انسانی زندگی کو کس طرح سے ڈیجیٹل کر دیا ہے کہ وہ اپنی ہی شناخت سے بے بہرہ ہو چکا ہے، اس صورتحال کو بخوبی اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔ بڑھتی ہوئی مصنوعات نے انسانی زندگی کو بھی مصنوعی بنا دیا ہے۔ انقلاب کے نام پر فرد کی ذاتی زندگی کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔ زندگی کے طور اطوار اس طرح بدل چکے ہیں کہ اب ضروریاتِ زندگی کے لیے انسانوں کی نہیں بلکہ اشیاء اور مشینوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ شخص جو ان مشینوں سے ناواقف ہے اسے سماج میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔ بلکہ یوں کہنا بجا ہے کہ اسے سماج میں رہنے کا کوئی حق نہیں جو اس عالمگیر صورتحال کا حصہ بننے سے انکاری ہے۔ یہی موضوعات ہیں جنہیں شفیق انجم نے اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے۔ انسانی تنہائی، جسے وہ عدم شناخت کے زمرے میں پیش کرتے ہیں، اُن کے ہاں بنیادی موضوع ہے۔ عالمگیر صورتحال نے تمام ثقافتوں کو ماتحت کر دیا ہے۔ جن پر صرف یورپی یا امریکی ثقافت کا ہی اثر و رسوخ رہتا ہے۔ پاکستان میں مغربی ثقافت کا بڑھتا ہوا رجحان اس بات کا ثبوت ہے۔ مشرقی ثقافتیں، مغربی ثقافتوں میں اس قدر تیزی سی ڈھل

رہی ہیں کہ انسان اس کے ساتھ بہتا چلا جارہا ہے۔ اور اپنی اقدار و روایات کو پیچھے چھوڑتا جارہا ہے۔ موجودہ دور میں اب انسان ایسے موڑ پر آن پہنچا ہے کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بھی تو اسے اپنی تاریخ، اپنی شناخت، اپنی تہذیب و تمدن اور ثقافت دور دور تک نظر نہیں آئیں گے۔ شفیق انجم کے افسانے اسی صورتحال کا اظہار کرتے ہیں۔ جس نے انسان کو اپنی ذات کے بحران سے دوچار کر دیا ہے اور وہ سماجی و نفسیاتی سطح پر تنہا ہو کر رہ گیا ہے۔ یوں فرد عدم شناخت کے مسئلے دوچار ہوتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے بقول "اُن (شفیق انجم) کی کہانیاں ایک طرف تو اپنے سیاسی سماجے منظر نامے سے جنم لیتی ہیں تو دوسری طرف ان کا ایک اہم مسئلہ فرد کی شناخت کا بھی ہے "(۳۳)

فرد کی عدم شناخت کا مسئلہ دوسرے لفظوں میں اُس کو تنہا کر دینے کا مسئلہ ہے۔ ٹیکنالوجی کے اس دور میں جہاں ہر شے مشین کی محتاج ہے وہاں انسان کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ انسان کی اہمیت کم ہونے سے انسانی بیگانگیت اور تنہائی میں اضافہ ہوا ہے۔ جس سے فرد کی شناخت کا مسئلہ بھی پیدا ہوا ہے۔ جسے شفیق انجم نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ شفیق انجم کے ہاں فرد کی شناخت کا جو تصور پیش کیا گیا وہ ڈاکٹر رشید امجد کے بقول:

> "یہ شناخت یک پہلو یا یک سطحی نہیں بلکہ نئے سائنسی انکشافات کے نتیجہ میں فرد اور کائنات کے جن رشتوں کا تصور ابھرا ہے اس کے بارے میں ایسے غور و فکر پر مشتمل ہے جس میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبہ بھی شامل ہے"۔ (۳۴)

ڈاکٹر رشید امجد کا اشارہ اس عالمگیر صورتحال کی جانب ہے جس نے انسان کو معاشرے میں نہ صرف تنہا کر دیا ہے بلکہ اسے ثقافتی طور پر نقصان بھی پہنچایا ہے۔ جس سے فرد کا فرد سے تعلق اور کائنات کا فرد سے تعلق بھی متاثر ہوا ہے۔ خاندانی نظام بدل کر رہ گیا ہے۔ جس نے سماجی سطح پر بھی بگاڑ پیدا کیا ہے۔

جہاں تک بات ہے خاندانی اقدار کی تو مشرقی ممالک میں آج بھی کہیں کہیں خاندانی رواداری باقی ہے۔ ایک فیملی کے افراد اکٹھے بیٹھتے ہیں آتے جاتے ہیں، والدین بچوں کو وقت دیتے ہیں اپنے بوڑھے بزرگوں کے پاس رہتے ہیں ان کی خدمت کرتے ہیں لیکن مغربی سماج میں یہ یکسر مختلف خاندانی نظام پایا جاتا ہے بچوں کو بورڈنگ سکول میں داخل کر دیا جاتا ہے یا پھر آیا کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو ان کی دیکھ بھال کرتی ہے، بوڑھوں بزرگوں کو اولڈ ہاؤس میں بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی اب مشرق میں بھی آہستہ آہستہ سرایت

کرتی جارہی ہے۔ یہ عالمگیر صورتحال مشرقی اقدار کو ایسے پامال کر رہی ہے کہ سماج کے کئی رسم ورواج بدل کر رہ گئے ہیں۔ کچھ متروک اور کچھ مروج ہوتے ہوئے نئے رواج پروان چڑھ رہے ہیں مشرق اور مغرب کے سماجی اقدار میں امتزاج بھی پیدا ہو رہا ہے جو کہ سماجی عالمگیریت کی مثال ہے۔ برتھ پارٹیاں، شادیوں کی رسومات، ایک دوسرے سے مخاطب کرنے کے لئے القابات، خاندانی مراسم میں تغیر و تبدل اس عالمگیر صورتحال کی بدولت رونما ہو رہا ہے۔ حمید شاہد اس قسم کی صورتحال کو ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> "ایک زمانہ تھا کہ ہم خوف، نفرت، غصہ اور مایوسی کو الگ الگ محسوس کرنے اور بیان کر دینے پر قادر تھے اب یوں لگتا ہے کہ ایسا ممکن نہیں رہا ہے۔ خوف کب نفرت میں ڈھلتا ہے اور نفرت کب غصے کے بعد مایوسی میں، ہم چاہیں بھی تو ڈھنگ سے جان ہی نہیں پاتے۔ مسلسل حراس نے آدمی سے اس کے حواس چھین لیے ہیں۔ جس عہد میں ہم جی رہے ہیں اسے محض حواس باختگی کا زمانہ ہی نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں زندگی کے لطف اور اس کے اندر موجود تخلیقیت کو لذت اور افادیت سے بدل لیا گیا ہے۔"(۳۵)

موجودہ دور میں فرد کی اہمیت اس کی افادیت سے قائم ہوتی نظر آتی ہے۔ ایک ہی خاندان کے افراد کے اپنے اپنے مقاصد ہیں۔ یہ خاندانی حالات اب ہر گھر میں آرہے ہیں پہلے یہ معاملات مغربی سماج میں پائے جاتے تھے جو اب مشرقی سماج میں بھی آچکا ہے۔ سوشل میڈیا، مشینی اور صنعتی ترقی نے لوگوں کو اتنا مشغول کر دیا ہے کہ خونی رشتوں کے پاس بھی وقت نہیں رہا اب فرصت کے لمحات کسی کے پاس نہیں رہے مشینری اور ٹیکنالوجی نے لوگوں کی تہذیب و ثقافت ہی بدل دی ہے۔ معاملات زندگی اور معمولات زندگی یکسر بدل گئے ہیں۔ اخلاقی اور تہذیبی اقدار بدل رہی ہیں۔ موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کو جس قسم کا سماج دینے کی تیاری کی جارہی ہے اس میں بے پناہ تھکن، بے مقصدیت، لایعنیت اور خاندانی نظام سے بیزاری، تنہائی اور بیگانگی ہے۔ اس ساری صورتحال کو شفیق انجم نے اپنے افسانوں میں بخوبی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس صورتحال کے تناظر میں شفیق انجم کے افسانے گم شدگی عنوان سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "یہ سب محض ایک تمنا سے زیادہ کچھ نہیں۔ میری پہچان میرے دائیں بائیں والوں سے وابستہ ہے اور میں کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہوں کہ وہ سب کے سب اک عذاب کے عالم میں ہیں۔ تو ایسے میرا سلامت رہ جانا محض ایک تمنا اور خواب ہو سکتا ہے۔ شاید سب

اپنے اپنے طور پر یہی گمان کر رہے ہیں اور خواب دیکھ رہے ہیں اور یقیناً خواب اور ر حقیقت میں دوریوں کے انت سمندر ہیں۔ لیکن یہ کوئی حتمی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے ہم میں سے کوئی بھی سرے سے موجود نہ ہو۔ نہ ناظر، نہ منظر، نہ نظارہ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے سمیت سب کچھ موجود تو ہو لیکن رسائی اور ادراک سے اتنا دور کہ باوجود کوشش کے بھی اس تک نہ پہنچا جا سکے، دیکھا اور سمجھا نہ جا سکے۔ شاید بہت آگے نکل جانے والوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ اور بہت پیچھے رہ جانے والے بھی یہ سب بھگتیں گے"۔ (۳۶)

شفیق انجم کے اس اقتباس سے جس بے یقینی اور بے اطمینانی کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ انسان کے ہجوم زدہ ماحول میں بھی اکیلا رہ جانے کی وجہ سے ہے۔ فرد کی شناخت اس کے ارد گرد ماحول یا خاندان سے براہ راست تعلق رکھتی ہے۔ فرد کو اس کا خاندان اور سماج شناخت دیتا ہے۔ لیکن جب فرد سماج میں اکیلا ہو جاتا ہے تو اس کی تمام شناختیں آہستہ آہستہ زائل ہونے لگتی ہیں۔ اس افسانے میں بھی فرد کے ہونے اور نہ ہونے کا مسئلہ مرکزی موضوع ہے۔ انسان اپنی شناخت کیسے بناتا ہے۔ اور شناخت بنانے کے بعد بھی اسے جب اپنی شناخت کا وسیلۂ اظہار میسر نہیں آتا تو پھر اسے اپنے ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ پھر وہ گمان اور حقیقت کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور اس کی اہم وجہ ثقافتی تغیر و تبدل ہے۔ یہ تبدیلی عالمگیر نوعیت کی ہے۔ مذکورہ بالا افسانے میں پس منظر کے طور پر انہیں نقوش کا اظہار کیا گیا ہے جس میں تمام ثقافتوں کو ذیلی ثقافتوں میں ڈھال کر ایک ثقافت کے ماتحت کر دیا گیا۔ جسے عالمی ثقافت کا درجہ دیا گیا۔ جو کہ مغربی ثقافت ہے۔ اس سے یہ ہوا کہ انفرادی اور امتیازی ثقافتیں اپنا تشخص اپنی پہچان کھونے لگیں۔ جس سے سماج میں رہنے والا فرد بھی لازمی طور پر متاثر ہوا۔ یوں ہر فرد اپنے تشخص، اپنی پہچان، اہمیت اور شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب خاندانی ثقافتوں اور تہذیب و تمدن کی جگہ اس ٹیکنالوجی نے لے لی جس کی وجہ سے ہر فرد نے اپنی نئی دنیا دریافت کر لی ہے۔ اس دنیا میں صرف اس کی اپنی ذات شامل ہے اس کے سوا اس کے خاندان کے فرد بھی وہاں سے نہیں گزر سکتے۔ گویا سماج کا ہر فرد ثقافتی تبدیلیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اور اس ہجوم میں بھی تنہا ہو کر رہ گیا۔ صدف سلطان اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے بعنوان "گلوبلائزیشن: مسلم دنیا پر ثقافتی اثرات" میں لکھتی ہیں:

"جدید عالمی نظام کی بنیاد الیکٹرانک، عقل اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ہونے والی حیران کن ایجادات پر ہے۔ یہ تحریک دنیا کے کسی نظام تہذیب، ثقافت، روایت اور جغرافیائی و سیاسی حدود کا اعتبار نہیں کرتی ہے۔"(۳۷)

بلاشبہ اس جدید عالمی نظام میں انسان تنہا ہو کر رہ گیا ہے کیوں کہ یہ عالمی نظام کسی ثقافت، تہذیب، یا روایت کو اعتبار نہیں بخشتا بلکہ دنیا اس کے ماتحت چلے اس بات پر اپنی پوری توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ اس نظام کے تحت رہنے والا ہر فرد جب اپنا تشخص اپنی شناخت پامال ہوتے دیکھتا ہے تو وہ سماجی و نفسیاتی سطح پر ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ہونے اور نہ ہونے کے معنی تلاش کرتا ہے۔ اپنی شناخت اور عدم شناخت کا معمہ حل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے چاروں طرف بے سکون، ہیجان، انتشار اور لایعنیت نظر آتی ہے۔ اور اس مسئلے کے حل میں ناکام نظر آتا ہے۔ معاشرے کے اسی کردار کو شفیق انجم نے اپنے افسانوں کا مرکزی کردار بنایا ہے۔ اس کردار کے ذریعے وہ شناخت اور عدم شناخت کے مسئلے میں الجھاؤ کو یوں پیش کرتے ہیں:

"میں ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھتا ہوں اور پھر اپنے آپ کو ٹٹولتا ہوں اور سوچتا ہوں۔ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان جگہ جگہ دراڑیں اور کھائیاں اور گہرے کھڈ ہیں۔ ان کے اندر گہری دھند جمع ہو چکی ہے۔ نیچے گندے سیال پانی کے ذخیرے ہیں۔ اور ان میں بڑے بڑے اژدھے اور مگرمچھ۔ گرنے والے کبھی ابھر نہیں پاتے"۔(۳۸)

شفیق انجم کے افسانے "میں کون ہوں؟" میں بھی اسی صورتحال کی عکاسی ملتی ہے۔ صنعتی ترقی نے جس طرح فطرت کو تباہ کیا ہے اور اس سے انسانی وجود اور انسانی ثقافتوں کی پامالی ہوئی ہے۔ دنیا دو طبقات میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طرف حاکم ہیں جو ظلم ڈھاتے ہیں اور دوسری طرف محکوم ہیں جو ظلم سہتے رہتے ہیں۔ وہ مجبور اور لاچار ہیں۔ جس سے خودکشی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ مذکورہ افسانے میں اس صورتحال کو عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس سے فرد کی شناخت اور عدم شناخت کا مسئلہ بھی اجاگر ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں جہاں صنعتی ترقی اس قدر عروج پر ہو تو وہاں انسانی اہمیت و افادیت کم اور مشینوں کی اہمیت و افادیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ صنعتی بوجھ انسان پر اس قدر لاد دیا جاتا ہے کہ وہ اس کی طاقت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے لیکن اس بوجھ کو مجبوراً اٹھانا پڑتا ہے۔ زندگی کا بوجھ جدید دور میں اس قدر انسان کی کمر توڑ رہا ہے کہ وہ سیدھا کھڑا ہو کر اپنی شناخت ہی نہیں کر پا رہا بلکہ وہ تو ایک بوڑھا ناتواں کندھوں پر زندگی کے بوجھ کو اٹھائے آگے

بڑھنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس مصروفیت نے اسے خود سے بھی بیگانہ کر دیا ہے۔ وب وہ اس نہج پر پہنچ چکا ہے کہ خود کو پہچاننا بھی اسے مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو طرح طرح سے پکارتا ہے خود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس دورِ انتشار نے نہ صرف اس سماج کو بکھیر دیا ہے بلکہ فرد کی شناخت اور اس کی پہچان بھی بکھر کر رہ گئی ہے۔ زندگی اس موڑ پر آچکی ہے کہ فرد اس کا محتاج نظر آتا ہے۔ یہ محتاجی اسے جینے پر مجبور کرتی ہے۔ حالانکہ وہ ایسی جگہ کا متلاشی ہے جہاں یہ دنیا کے جھمیلے نہ ہوں۔ شفیق انجم کے افسانے "میں کون ہوں؟" کے مرکزی کردار سے یہ ساری صورتحال نمایاں کی گئی ہے۔ جو مستقبل کا خواب دیکھنے یا نہ دیکھنے کا اپنی طرف سے گمان بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ زندگی کسی کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن چکی ہے۔ اور اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو ہو رہا ہے یا جو بیت رہا ہے وہ اسے ایسے ہی گزار رہا ہے۔ اور زندگی کو یوں ہی کسی دوسرے کی ڈائریکشن کے مطابق گزارنا اس کی مجبوری بن چکی ہے۔ اس کے بغیر اس کی زندگی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ زندگی محتاج ہے ایک صارف کے ہاتھوں۔ وہ صارف جس نے انسان کو انسان کے بجائے ایک پراڈکٹ بنا دیا ہے۔ اب انسان کے بجائے شے کو اہمیت حاصل ہے۔ افسانے کا کردار اس ساری صورتحال میں اوندھے منہ گر بھی جائے تو اسے اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔ اس صورتحال میں اب وہ کولہو کے بیل کی طرح ہانکا جا رہا ہے۔ اور مفاد پرست اس سے جو مقاصد یا فوائد چاہتے ہیں، حاصل کر رہے ہیں۔ وہ چیخے چلائے اس سے انہیں فرق نہیں پڑتا۔ اور اب تو یہ صورت ہے کہ کردار نے بھی چیخنا چلانا چھوڑ دیا ہے۔ کسی قسم کی مزاحمت یا دفاع کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ظاہر سی بات ہے جب مزاحمت یا دفاع کا کوئی فائدہ نہیں کوئی سنوائی نہیں تو انسان خود کو بے بس اور تنہا تصور کرتا ہے۔ اُس کا پُرسانِ حال کوئی نہیں تو اسے مجبوراً خاموشی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ وہ پھر اندر ہی اندر خود سے جنگ لڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں بھی یہی کچھ عکاسی کی گئی ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "بھلا میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا وہی ہوا ہے اور جو ہو رہا ہے اسی نے ہونا تھا۔ وہ بڑبڑایا۔ چہرے پر اداسیاں زرد روغن مل رہی تھیں اور ہونٹوں کا ارتعاش کچھ ایسا تھا جیسے وہ بول نہیں رہا قے کر رہا ہے۔ آنکھوں میں کرب کی سرخ لکیریں کچھ مزید واضح ہو گئی تھیں اور پھر تھوڑی دیر بعد واقعی اس نے قے کر دی۔ منہ سے جھاگ سی اڑ اڑ کر ارد گرد گرنے لگی۔ قبیح لفظوں کی گرانی نے اندر ہی اندر اودھم مچا رکھا تھا، راہ پاتے ہی ابل ابل کر باہر آنے لگے اور وہ دیوانوں کی طرح چیخنے لگنے۔۔۔

میں۔۔۔ میں گندی نالی کا کیڑا ہوں، گندگی کا ڈھیر ہوں، گوبر کی بُو ہوں، ٹھہرا ہوا غلیظ پانی ہوں، سڑی ہوئی بدبو دار مٹی ہوں، کچرے سے جلنے والی آگ ہوں، خبیث چڑیلوں کی پیٹ سے نکلتی بُو ہوں۔۔۔ وہ چیختا رہا اور دیر تک اس کی یہی حالت رہی کہ لفظوں کی قے منہ بھر بھر کے خود اپنے ہی بدن پر اگلتا رہا۔ آخر کار چکرایا اور اوندھے منہ دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ مٹی نتھنوں کے اندر گھستی چلی گئی لیکن وہ اپنے آپ میں مست تھا۔ چیخنے کی طاقت نہ رہی تو بڑبڑانے لگا۔۔۔ میں ہوں!! ہاں ہاں میں ہوں۔ میں۔۔۔ میں کولہو کا بیل ہوں، فیکٹریوں کا دھواں ہوں، ملکوں کو مالشی ہوں، گٹر کا ڈھکن ہوں، بجھے ہوئے چراغ کا بے نور پیندا ہوں۔۔۔ درد اندر ہی اندر بلبلاتا رہا۔ کرب آنکھوں اور منہ کے رستے چشمے کی طرح ابلتا رہا اور وہ اوندھے پڑا مدہوش ہوتا چلا گیا"۔ (۳۹)

اس افسانے میں مرکزی کردار پر ہونے والے جبر نے اس کی ذات کو اس قدر پاش پاش کر دیا ہے کہ وہ منفی رویوں میں بہتا چلا گیا۔ اور اپنی ذات کو فنا ہوتا دیکھ کر خود سے ہمکلامی کے دوران زندگی کی پست سطح پر آن پہنچا۔ اور زمانے کے اعلیٰ طبقے کی نسبت سے وہ خود کو حقیر، تنہا، مجبور اور لاچار سمجھنے لگا۔ اس ساری صورت حال نے اسے ایک نفسیاتی ہیجان کا شکار کر دیا ہے۔ اب وہ خود کو بھی پہچاننے سے انکاری ہے۔

اسی طرح ان کا ایک اور افسانہ "دیمک زدہ کھنڈر آس" کو بھی اس تناظر میں پیش کیا جا سکتا ہے جس میں ایک اہم مسئلے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جس کے دو رُخ ہیں۔ ایک یہ کہ معاشی ترقی نے انسان کو اس قدر مصروف کر دیا ہے کہ وہ خود سے بیگانہ ہو کر تنہائی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس ترقی کے باوجود، ہر شے پا لینے کے باوجود بھی وہ احساسِ محرومی کا شکار ہو گیا ہے۔ احساسِ محرومی نے اسے اس نہج پر لا کھڑا کیا ہے کہ اس کے پاس اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ مل بیٹھنے کا وقت ہی نہیں رہا۔ زندگی کی دوڑ میں وہ اگرچہ بہت آگے نکل گیا ہے لیکن اس نے تمام رشتے ناطے پیچھے چھوڑ دیئے ہیں۔ اب ان رشتوں کو وہ چاہتے ہوئے بھی دوبارہ حاصل نہیں کر پا رہا۔ یہاں اس کی لاچاری اسے احساسِ محرومی کا شکار کر دیتی ہے۔ جو زندگی کی تنہائی کی صورت میں اسے کاٹتی رہتی ہے۔

دوسرا رُخ یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ اور مشینی دور میں انسان کی مثال اس قبر کی طرح ہو گئی جسے قبرستان میں دفنانے کے بعد بھلا دیا جاتا ہے۔ اور وہ آہستہ آہستہ اپنی ہی مٹی میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ اس کی خبر

گیری کرنے والا پہلے پہل تو آتا رہا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے پوچھنے والا کوئی بھی نہیں رہا۔ افسانے کا کردار تمثیلی انداز میں گلی کی نکڑ پر جلتے چراغ کو دیکھتا ہے کہ شاید کوئی اس کی طرف آجائے اس کی خبر گیری کرنے ادھر کو چل پڑے لیکن کوئی بھی اس کی جانب نہیں آتا۔ افسانے کا کردار اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے کہ وہ کتنے اچھے دن تھے جب وہ ایک دوسرے سے خوش گپیاں کرتے تھے مل بیٹھتے تھے ایک دوسرے کی فکر کرتے تھے لیکن وہ دور آ گیا ہے کہ ہر کوئی اتنا مصروف ہے اتنا گم ہے کہ اپنے خون کے رشتوں کو بھی بھلا دیا گیا ہے۔ قبروں میں دفنائے لوگوں کو بھلا کب تک یاد رکھا جا سکتا ہے۔ اب تو قبروں میں دیمک اسے چاٹ چاٹ کھائے جا رہی ہے۔ وہ جو پہلے ایک مقبرے کی سی صورت تھی اب وہ کھنڈر بن چکا ہے۔ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کھنڈر کی جانب آئے اور اس کی حالتِ زار پر دو آنسو بہا جائے اس کی حالت کو درست کر سکے۔ افسانے کا کردار جو کہ ایک مردہ کردار ہے اور ایک قبر سے بول رہا ہے۔ سب علامتی ہے۔ یہ دنیا جسے افسانہ نگار نے قبرستان کہا ہے اس میں رہنے والا انسان ایک قبر کی طرح اپنی تنہائی میں پڑا ہے۔

> "یوں کہانی کار کے لئے کردار کا حلیہ بیان کرنا، کردار کی خصوصیات کا تعین کرنا ضروری نہیں رہا۔ اب وہ علامت، امیجز وغیرہ کی امداد سے لاشعوری عمل کی کارفرمائیوں پر روشنی ڈال کر کردار کی فطری نہیں بلکہ نفسی تصویر پیش کرنے کی کوشش ہے"۔ (۴۰)

چراغ کی لو فرد کو شہر کی جانب دیکھنے پر مجبور کرتی ہے جو اس کی آس بناتی ہے کہ کوئی تو ہو گا جو اس طرف آئے گا لیکن افسانے کے آغاز سے لے کر آخر تک مرکزی کردار کی یہ آس پوری نہیں ہوتی۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں جہاں لوگوں کی مصروفیت کی عکاسی کی ہے وہاں ان کی بے حسی کو بھی ایک لحاظ سے نمایاں کیا ہے۔ انسانی بے حسی نے معاشرے کے ہر فرد کو ایک دوسرے سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ اور اب اپنی تنہائی میں مر مر کر جینا اس کی مجبوری بن چکا ہے۔ مذکورہ افسانے کے آغاز میں ہی اس صورتحال کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

> "اُداسی پھن پھیلائے چاروں اور گھوم رہی ہے۔ گہرے سناٹوں میں پھنکارتی پژمردہ چاپ، لرزتے سائے اور مسلسل مدھم ہوتے کچھ بوسیدہ نقش۔ دروازے بند ہیں، بالکل بند اور اندر شاید کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔ باہر گلی بھی سنسان ہے اور بارش

ایسی تیز کہ گویا آج سب کچھ بہالے جائے گی۔ دور نکڑ پر کوئی چراغ سا ٹمٹمارہا ہے۔ یخ ٹھنڈی طوفانی رات میں ادھر کون آئے گا۔ کھنڈر یادوں کے ویرانے تو بہار موسموں میں بھی آباد نہیں ہو پاتے، اس موسم میں ادھر کون آئے گا۔ دور، حدِ نظر کے دوری پر جھلملاتی روشنیوں والی بستی آباد ہے۔ ہر طرف ہلچل، ہر طرف لبالب بھری زندگی، چھلکتے پیمانوں کے دوش پر رقساں نقرئی کھنکھناہٹیں۔ زندگی تو اُدھر کہیں، کسی نشیلی ترنگ کی بانہوں میں بانہیں ڈالے تھرک رہی ہے۔ اِدھر کون آئے گا۔ کھنڈر میں کچھ سائے لرزاں ہیں، کچھ بوسیدہ نقش اور کوئی پھنکارتی ہو پژمردہ چاپ۔ اداسی اندھیروں کے ساتھ قدم قدم رینگتی در و دیوار میں گھسی چلی جارہی ہے اور میں۔۔۔ اور میں کہ جو انہی دیواروں کے بیچوں بیچ کہیں دفن ہوں، دیمک زدہ آنکھوں میں گلاب سجائے دور گلی کے نکڑ پر ٹمٹماتے چراغ کو تکے چلا جارہا ہوں۔ شاید کوئی چلا آئے۔ کوئی نقرئی کھنکھناہٹ، کوئی نشیلی ترنگ۔۔۔ لبالب بھری زندگی۔ مدتیں ہوئی اپسے گئے ہوئے۔ کاش وہ لوٹ آئے"۔(۴۱)

افسانے کا کردار تنہائی کے اس عالم پر ہے جہاں زندگی کی ایک کرن بھی نظر آجائے تو تڑ اُٹھتا ہے۔ لیکن کردار ہمہ تن تنہائی کا پیکر معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کئی بھی چاہنے والا نہیں ہے۔ اداسی اس کا گھر ہے۔ دیمک اس کی آنکھیں چاٹ رہی ہے جبکہ وہ دور چراغ کی ٹمٹماتی لو کو دیکھنے پر مُصر ہے۔ امید کی یہ کرن افسانے کے آخر تک پہنچتے پہنچتے ٹوٹ جاتی ہے۔ اور کردار خود اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نہیں اب اس کے لیے اس جہاں میں کوئی بھی شخص باقی نہیں ہے جو اسے آئے اور تسلیاں دے۔ اس کی خبر گیری کرے۔ اس افسانے کے اختتام پر کردار سے جو کلمات کہلوائے گئے ہیں ان کے مطابق تنہائی اب اس کا مقدر ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"کھنڈر آنکھوں میں گلاب سجائے، دور گلی کے نکڑ پر ٹمٹماتے چراغ کو میں تکے چلا جارہا ہوں۔ شاید کوئی چلا آئے۔ کوئی نقرئی کھنکھناہٹ، کوئی نشیلی ترنگ۔۔ لبالب بھری زندگی۔ یخ ٹھنڈی طوفانی رات گھمبیر تر ہو رہی ہے۔ اس موسم میں اِدھر کون آئے گا۔۔ شاید کوئی بھی نہیں۔۔۔ آہ! کوئی بھی نہیں"۔(۴۲)

تنہائی اور جبر کی اس صورتحال کی عکاسی ان کے ایک اور افسانے "میں مصور و نقش گر" میں بھی دکھائی دیتی ہے یہ افسانہ ان کی دوسری کتاب "لکھت لکھتی رہی" میں شامل ہے۔ اس افسانے میں عام آدمی اور خاص آدمی میں فرق کو بخوبی واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح انسان معاشرے میں طبقاتی نظام کی کشمکش میں پھنستا جارہا ہے۔ اور ایک عام آدمی جب کسی کا شاہانہ طرزِ زندگی دیکھتا ہے تو لازمی بات ہے اسے اپنے آپ پر شرمندگی ہوتی ہے اور خواہش کرتا ہے کہ کاش وہ بھی ایسی ہی شاہانہ زندگی بسر کرے۔ ڈاکٹر صفیہ عباد اس صورتحال کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں:

> "ایسی صورتحال میں جو اداسی اور تنہائی ہے وہ انسان کو سماج سے الگ تھلگ ایک ایسی ذہنی سوچ کے کونے میں دھکیلتی چلی جاتی ہے جہاں مثبت، پر امید اور ایک صحت مند زندگی گزارنے کا رویہ اور طریقہ اس سے چھن جاتا ہے"۔ (۴۳)

افسانے "میں مصور و نقش گر" میں جو اصل نکتہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ عام آدمی چاہے جتنے مرضی خواب دیکھ لے ان کی تعبیر کے لیے انہیں زندگی داؤ پر لگانی پڑتی ہے اور تاعمر اسی کوشش میں گزار دیتے ہیں کہ ان کی زندگی پُر سکون اور آرام دہ گزرے لیکن ان کی کوئی بھی آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔ وہ خواہش تو کر سکتے ہیں لیکن خواہش کا اظہار نہیں کر سکتے جبکہ امیر آدمی یا اشرافیہ کے لوگ اپنی شاہانا زندگی سے عوام کو نفسیاتی طور پر متاثر کرتے ہیں۔ اس افسانے میں داستانوی اسلوب اور تکنیک سے شہزادے اور شہزادی کی آمد اور ان کے رقص و سرود کی جو منظر نگاری کی گئی ہے اسے ایک کیمرہ مین یا مصور جب اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے اور ان کے نقوش بناتا ہے تو دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کا دل اس جسارت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کاش اس کی بھی کوئی ایسی ہی شہزادی ہوتی اور وہ اس کا شہزادہ ہوتا۔ اسی طرح رقص و سرود کی محفل ہوتی۔ شاہانا کھانے ہوتے۔ اونچے محل ہوتے لوگ ان کے آنے کا انتظار کرتے جب آتے تو ان کا شاہی استقبال کیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار جو پوری تقریب یا تمام مناظر کی منظر کشی کر رہا ہے ایک عام انسان ہے۔ اور اس سارے منظر کو دیکھ کر اس کے دل خواہش جاگتی ہے کہ وہ بھی کاش انہی کی قبیل سے ہوتا۔ اسے اپنی پست زندگی کا خیال اپنی محرومیوں میں لے جاتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ شہزادی میرے ساتھ رقص کرے۔ وہ تو اسے لاشعوری طور پر کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی اوقات بتا دیتی ہے کہ تو

نقش بنا جو کہ تیر اکام ہے۔ اور پھر وہ ان محرومیوں میں نقش گری کرنے لگتا ہے۔ اور اپنے بارے میں سوچنے لگتا ہے کہ میں کہاں اور شہزادی کہاں۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "اور ایسے میں مجھے یاد آیا اپنا گرد آلود سیلن زدہ کمرہ اور متعفن گلی کوچے اور وہ کہ جسے میں بے طرح چاہتا تھا مگر کُھلتا اس لیے نہیں تھا کہ میرے پاس اسے دینے کو کچھ نہیں تھا۔۔۔ نہ آرام بھری زندگی نہ خوشبو بھرے خواب۔ میں کہ اک مصور و نقش گر۔۔ نادیدہ ہاتھ میرے کندھے پر بہت زور سے تھپتھپایا گیا اور سرگوشی ہوئی تو میں سہا اور خوب خوب سہا اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا اور دیکھا اور نقش کیا کہ شہزادی اور شہزادہ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے گہری نیند سوئے ہوئے ہیں اور ان کے چہروں پر نرمیلا تبسم پھیل رہا ہے، مسلسل پھیل رہا ہے"۔ (۴۴)

دراصل اس افسانے میں انسان کی محرومی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس محرومی سے ہی انسان تنہائی اور بیگانگی کا شکار ہوتا ہے۔ انسان بڑے بڑے خواب تو دیکھتا ہے لیکن ان کی تکمیل اور تعبیر مشکل سے ہی تلاش کر پاتا ہے۔ اس کے لیے محنت اور لگن چاہیے لیکن جہاں معاشرے میں دنیا دو طبقات میں تقسیم ہو جائے جہاں ایک طاقت ور اور دوسرا کمزور طبقہ سامنے آجائے ظالم اور مظلوم کے مقابلے اور جنگ میں ہمیشہ ظالم جیتتا ہے۔ جبکہ مظلوم اپنی جنگ ظالم سے ہارنے کے بعد خود سے لڑنا شروع کر دیتا ہے۔ جہاں طاقت ور اپنی جیت کی خوشی منا رہا ہوتا ہے وہیں مظلوم ہارنے کے بعد اپنی ذات سے جنگ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس جنگ میں بھی وہ خود کو ہار لیتا ہے۔ کیوں کہ اس معاشرے میں جہاں ایک اعلیٰ اور خود سر طبقے کی حکمرانی ہو وہاں عوام کی سنوائی اور اُن کی جیت کا امکان ناممکن ہوتا ہے۔ شفیق انجم نے اس افسانے میں اس کشمکش کو بہت سادگی کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ خواص کے سامنے عوام کا زور نہیں چل سکتا۔ وہ ہمیشہ بے بس اور تنہا و لاچار زندگی گزارنے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ ایسی زندگی کی بے رنگی اور بے چہرگی حوالے سے ڈاکٹر جمیل اختر مجبی رقمطراز ہیں کہ:

> "کتنی کریہہ اور خوفناک ہے آج کی زندگی، کتنا کربناک اور افسوس ناک، پھر اس ماحول میں سانس لیتا ہوا انسان، اپنے وقت سے وابستہ، اپنے خیالات سے متصادم یہ تمام امور زندگی کے حزینہ اور المیہ پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں"۔ (۴۵)

اسی طرح کی طبقاتی کشمکش، غریب اور امیر کے مابین تناؤ کی صورتحال اُن کے ایک افسانے "ادھوری کہانی" میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ افسانہ ان کے تیسرے افسانوی مجموعے "روشنی آواز دیتی ہے" میں شامل ہے۔ اس افسانے میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ایک امیر صاحب کو اپنی کہانی سناتا ہے اور اس کہانی کے دوران اس کی کسمپرسی کی حالت کے واقعات کا ذکر ہوتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ کیسے اپنی اولاد کے لیے دن رات محنت کرتا ہے۔ لیکن محنت کرنے کے باوجود بھی اسے وہ مقام حاصل نہیں ہو پاتا جو کہ ایک امیر آدمی کو ہو سکتا ہے۔ جس اولاد کو پڑھانے کے لیے وہ دن رات ٹیکسی چلاتا مزدوری کرتا تھا اپنے بیٹے اور بیٹیوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے نجانے کتنی نیندیں اس نے گنوائی تھیں۔ لیکن اس محنت کے باوجود ایک دن وہ ابدی نیند سو گیا اور اس کی اولاد پھر سے بے سہارا ہو گئی۔ ڈاکٹر شفیق انجم نے اس افسانے میں بڑی عمدگی سے اس صورتحال کی منظر کشی کی ہے۔ اور غریب آدمی کا سماج میں کیا کردار ہے اور وہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے کیا کچھ کرتا ہے اسے بہت اچھے انداز میں نمایاں کیا۔ اور یہ واضح کیا کہ غریب آدمی ساری زندگی غریب بے بس لاچار مجبور اور بے سہارا رہتا ہے۔ غریب آدمی زندگی بھر تنہائی کاٹتا ہے ایسی تنہائی کہ زندگی بھر اس کا کوئی ساتھی نہیں بنتا۔ اسے ہر شخص نظر انداز کرتا ہے۔ اس کی زندگی تمام ہو جاتی ہے لیکن اسے کفن اور قبر بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ اس افسانے میں یہاں تک واضح کر دیا گیا کہ غریب آدمی کا قدرت بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ گویا اسے ہر طرح سے تنہائی اور تنہائی کا سامنا رہتا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "غریب آدمی اپنی اولاد کو محرومیوں سے بچانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتا۔ مشقتیں کرتے کرتے اپنی کمر دوہری کر لیتا ہے، اپنا اوڑھونا بچھونا بھول کر، دکھتے تھکے جسم کے ساتھ قدم قدم گھسٹتا رہتا ہے تاکہ اپنے بچوں کے خوابوں میں رنگ بھر سکے لیکن مصیبت کے پاڑ پھر بھی اپسی پر ٹوٹتے ہیں۔۔۔ قدرت بھی مرے ہوئے کو مارتی ہے۔ خوشی اور خوشحالی زمینی خداؤں کے اختیار اقتدار کی باندی بن کر ان کی خدمت بجا لاتی ہے لیکن معلوم نہیں آسمان کیوں پیدا کر کے بھلا بیٹھا ہے۔۔۔ آفرین ہے کہ غریب اس کے باوجود بھی آسمان ہی پر نظریں جمائے رکھتا ہے۔ اِس یقین کا اگر کچھ صلہ ہے اور یقیناً ہے تو کیا ہی اچھا ہو کہ اس کا کچھ حصہ موجود زندگی میں ہی عطا کر دیا

جاتا۔ لیکن شاید غریب کی سسکیاں اور فریادیں بھی اُس کی قسمت کی طرح کاٹھ کباڑ سے زیادہ کچھ نہیں"۔ (۴۶)

ان تمام تر مصیبتوں اور مشقتوں کے باوجود افسانے کا مرکزی کردار اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ حالانکہ وہ گھر کا واحد کفیل تھا۔ اپنے بچوں کی تعلیم پوری کرنے کے لیے وہ دن رات ٹیکسی چلاتا تھا لیکن قدرت کو بھی غریب پر ترس نہ آیا اور وہ فوت ہو گیا۔ اس کی اولاد پھر سے بے سہارا ہو گئی۔ وہ خوشیاں وہ خواب جو ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی اولاد کے لیے دیکھ رکھے تھے ان کی تعبیر ممکن نہ سکی۔ اور کہانی یوں ہی ادھوری رہ جاتی ہے۔ شفیق انجم نے اس کردار کے ذریعے سماج کے ایسے المیے کو اجاگر کیا ہے جس سے نہ صرف افراد کے مابین بیگانگی جنم لیتی ہے بلکہ اس سے نسلیں اپنی تنہائی، لاچاری اور مجبوری کی فصلیں کاٹتی ہیں۔ افسانہ نگار نے ٹیکسی ڈرائیور کو اس سماج کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔

شفیق انجم کی کتاب "روشنی آواز دیتی ہے" سے ایک اور افسانہ بعنوان "شور میں گم ماتم" تنہائی کے اس جبر کو بڑی عمدگی سے بیان کرتا ہے۔ جس میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو شہر کے شور میں اپنے دکھ اور تنہائی کی چیخیں دبائے بیٹھا ہے۔ ایک ایسی عمارت کے بیچوں بیچ کمرے میں تنہا رہنے والا شخص ساتھ والے کمروں کی مختلف آوازیں اور شور سنتا ہے غور کرتا ہے۔ کبھی کسی کے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی ہے تو کبھی رونے اور چیخنے چلانے کی آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکراتی ہیں۔ صبح صبح جھاڑو لگانے کی آوازیں، مسجد سے اذان کی آوازیں، گلی سے نمازیوں کے گزرنے کی آوازیں اور آہٹیں، دکانوں اور ہوٹلوں کے شٹر کھلنے کی آوازیں، رکشوں سوزوکیوں، کے ہارن اور ڈرائیور کی آوازیں، گاڑیوں، موٹر سائیکلوں کا شور اور ٹریفک وارڈن کی سیٹیاں، کام کاج کی کھٹاخ پٹاخ۔ ویلڈروں، مکینکوں، الیکٹریشنوں اور بیسیوں قسم کے اوزاروں کی گڑگڑاہٹیں، کباب والے کے توکوں کی ٹکاٹک، بھیک مانگنے والوں کی التجائیں اور دعائیں، سستہ مال بیچنے والوں، سبزی فروٹ والوں، کباڑیوں اور دودھ فروشوں کی صدائیں، راہگیروں کی سپڑ سپڑ باتیں، کھنکار، چیخیں، قہقہے، توتکار، وغیرہ کا شور اس کی سماعتوں سے رات دن ٹکراتا رہتا ہے۔ وہ سب کا شور سنتا ہے ایک ایک آواز کو پہچانتا اور سوچتا رہتا ہے لیکن اس کے اندر کی تنہائی اور اس تنہائی کا ماتم، ماتم سے اٹھنے والا شور کوئی بھی نہیں سن پاتا، وہ باہر کے شور میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ اُس کے دکھ درد اور تنہائی کا مداوا باہر کے شور کی نظر ہو جاتا ہے۔ مذکورہ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"شور زندہ ہوتا۔۔۔ متن بناتا ہے۔

نئے کردار پرانی کہانی کو چلائے رکھتے ہیں۔ اور قبرستان اور نیم کے درخت کے بیچ، بالائی منزل پر۔۔۔ کوئی سوگواری سے آئینہ دیکھتا، کہانی کا سیاق وسباق سوچتا رہتا ہے۔ بس سوچتا رہتا ہے"۔(۴۷)

افسانے کا کردار اس قدر لاچار نظر آتا ہے کہ کمرے کی تنہائی سے بھاگ کر عمارت کی دیوار کے ساتھ لگے نیم کے درخت کے پاس آکر وقت گزاری کرنے لگتا۔ وہ سوچتا کہ میری طرح اس درخت کا بھی کوئی نہیں ہے جو اس سے باتیں کریں اس کے دکھ سکھ بانٹے۔ لیکن بدقسمتی سے افسانے کے آخر میں اس درخت کو بھی وہاں سے کاٹ لیا جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نئی عمارت کمرشل سوچ کے تحت بنائی جاتی ہے۔ وہ شور جسے سے بھاگ کر وہ درخت کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھتا تھا اب وہ درخت بھی اس سے جدا ہو گیا ہے۔ اب وہ مکمل طور پر تنہا ہو گیا ہے۔ سماج نے اس کا واحد سہارا بھی اس سے چھین لیا ہے۔ اس افسانے کا آخری حصہ ملاحظہ کیجیے:

"۔۔۔ منشی کو کہتے سنا کہ پچھواڑے کی کالی جگہ بک چکی ہے۔ نئے مالک نے ٹھیکہ دے دیا ہے۔ درخت کاٹنے والے آج کل میں آجائیں گے۔ پلازہ بنے گا۔ کرایے پر لوگ رہیں گے۔۔۔

۔۔۔ برس ہا برس کی رفاقت کے دن ختم ہونے کو ہیں۔ کون کس کے بغیر کب تک جیے گا، معلوم نہیں۔۔۔ اداسی ٹہنی ٹہنی پھیل رہی ہے، پرندے گم صم، سخت مغموم، شاید اُدھر بھی یہ خبر سنی جا چکی ہے۔۔۔

خواب وخواہش۔۔۔ خس۔

بے متن شناسائی۔۔۔ خاک۔

۔۔۔ گھمبیر تا نیم کے درخت سے اترتی کمرے میں آ بیٹھتی ہے۔ رات، مسلسل پھیلتی، گہری ہوتی رات۔۔۔ کھڑکی سے سڑک کے اُس پار کا منظر، قبرستان، قالب بدلتا منظر،

سرگوشیاں کرتی کھسر پھسر، لاٹھی ٹیکتی چاپ، چوکیداروں کی سیٹیاں اور آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔۔۔

روئیدگی کا پھیکا پن، بہار موسموں میں ہچکی بھر۔۔۔ بے متن آنسو۔

ساتھ والے کمرے کا جوشیلا کارکن ایک ارب درخت لگانے کی منصوبہ بندی پر نعرے لگا کر سو چکا ہے۔۔۔ تعویذ گنڈے والے کی پھونکیں تقدیر بدلتی، خراٹوں میں ڈھل چکی ہیں۔۔۔ ڈھول والے مشٹنڈے غپاڑہ کر کر ایک دوسرے پر اوندھے منہ پڑے ہیں۔۔۔ گرو اپنے چیلوں میں ڈیوٹیاں بانٹ، کل کی دیہاڑی کا سوچتے نیندوں اتر چکے ہیں۔۔۔ منشی دب بھر جگاڑ لگاتا، جگاڑ خوابوں میں گم ہے۔۔۔

ماتم۔۔۔ تیز ہوا کا شور، آندھی، بادلوں کی گڑگڑاہٹ۔

۔۔۔شناسا دستک اور دھکیل کے ساتھ دروازہ کھلتا ہے۔

اور رنجیدہ بُور اور پتوں اور قدیمی محبت کی ہچکیوں سے کمرا بھر جاتا ہے۔"(۴۸)

حاصلِ بحث یہ ہے کہ شفیق انجم نے اپنے افسانوں میں تنہائی کے جس عمیق درجے کو بیان کیا ہے وہ انسانی ذات اور اس کی شناخت و عدم شناخت کا قضیہ اجاگر کرتی ہے۔ انسان بعض اوقات زندگی کے تھپیڑوں سے اس قدر گھبرا جاتا ہے کہ اسے اپنی ذات میں ہی گم ہونے میں مداوا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ڈوب کر اپنی شناخت واپس پانے میں ہر وقت مصروف رہنا چاہتا ہے۔ پھر اسے باہر کا شور اپنے اندر ہونے والے ماتم سے زیادہ کٹھن معلوم ہوتا ہے۔ وہ اکیلا خاموش چپ چاپ، تنہا رہنا پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ سماج کے ہاتھوں اپنی شناخت جب گنوا بیٹھتا ہے تو عدم شناخت اسے اپنی ذات میں اتارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم کے ہاں شناخت اور عدم شناخت کے انہی پہلوؤں کا ذکر ان کے بیشتر افسانوں میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم نے فرد کی شناخت اور عدم شناخت کے موضوع کو بہت زیادہ فوقیت دی ہے۔ انہوں نے انسانی سماج میں بے ہنگم رویوں کو سمجھا ہے اور اس سے سماج میں جو بدلاؤ آیا ہے اس کے فرد پر اثرات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور اس سماج میں رہنے والے متاثرہ شخص کو اپنے افسانوں کا مرکزی کردار بنایا ہے۔ جس سے ان کے افسانوں میں سماجی، نفسیاتی اور شناختی سطح پر جبر و تنہائی کی عکاسی ملتی ہے۔

حوالہ جات

1.Popular Oriental Practical Dictionary ,Oriental Book Society , Lahore,2002,p174

۲۔ محمد عبد اللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۱

۳۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے مین اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع دوم ۲۰۱۰ء، ص ۳۳۱

۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، روشنی آواز دیتی ہے، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص ۷۷

۵۔ ایضاً، ص ۷۶

۶۔ ایضاً، ص ۱۶

۷۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۷

۸۔ ایضاً، ص ۲۹

۹۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۰۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، اسلوب اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۸۱

۱۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، ص ۴۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۲

۱۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، ص ۹۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۱۵۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، ص ۸۰

۱۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، ص ۳۹

۱۷۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، ص۴۸-۴۹

۱۸۔ ایضاً، ص۴۳

۱۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، ص۱۷

۲۰۔ ایضاً، ص۴۳

۲۱۔ ایضاً، ص۴۳

۲۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، ص۹۷

۲۳۔ ایضاً، ص۵۳

۲۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، ص۸۵

۲۵۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، ص۳۶

۲۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، خود شناسی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۳۴

۲۷۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، روشنی آواز دیتی ہے، ص۱۱۰

۲۸۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، ص۱۷

۲۹۔ ایضاً، ص۳۵

۳۰۔ ایضاً، ص۶۴

۳۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، روشنی آواز دیتی ہے، ص۶۷

۳۲۔ صبا اکرام، جدید افسانہ-چند صورتیں، فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۲۰۰۱ء، ص۵۳

۳۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، ص۸

۳۴۔ ایضاً، ص۸

۳۵۔ حمید شاہد، محمد، "اردو افسانہ: صورت معنی"، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص۲۳۸

۳۶۔ ایضاً، ص۲۹

۳۷۔ صدف سلطان، گلوبلائزیشن: مسلم دنیا پر ثقافتی اثرات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، (غیر مطبوعہ)، یونی ورسٹی آف دی پنجاب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۷۲

۳۸۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، ص۲۹-۳۰

۳۹۔ ایضاً، ص ۴۳-۴۴

۴۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ: حقیقت سے علامت تک، اردو رائٹر گلڈ، الہ آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۶۴

۴۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں ص۶۹

۴۲۔ ایضاً، ص ۴۷

۴۳۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، راگ رت، خواہش مرگ اور تنہا پھول، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء، ص۲۷

۴۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، ص ۲۳

۴۵۔ جمیل اختر مجبی، ڈاکٹر، فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۳۰

۴۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، روشنی آواز دیتی ہے، ص ۱۰۲

۴۷۔ ایضاً، ص ۹۳

۴۸۔ ایضاً، ص۹۷-۹۸

باب چہارم

ماحصل، نتائج، سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ

شفیق انجم کی افسانہ نگاری معاصر افسانہ نگاروں میں اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں حاشیے پر پڑے ہوئے افراد کو فوقیت دی گئی ہے۔ اُن کی افسانہ نگاری میں پسے ہوئے، استحصال زدہ، مظلوم، مجبور اور مسخ شدہ شناختوں کے حامل افراد کو موضوعِ افسانہ بنایا گیا ہے۔ انہوں نے سماجی سطح پر اِن افراد کے مسائل اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں ایک اعلیٰ طبقہ خاطر میں نہیں لاتا اور انہیں مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ان کے احساسات و جذبات اور کیفیات کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم نے معاشرے میں سرمایہ دارانہ اور طبقاتی نظام کے صرف نقائص ہی اجاگر نہیں کیے بلکہ اس سے پیدا ہونے والا سماجی بگاڑ، انسانی ہیجان اور انفرادی اثرات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ سماج میں رہنے والا ہر وہ شخص جس کی شناخت چھین لی گئی ہو یا مسخ کر دی گئی ہو، شفیق انجم کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔ یہ شناخت چاہے سیاسی ہو، معاشی، سماجی یا تکنیکی ہو، یا پھر اقتصادی یا ثقافتی سطح پر قائم ہوئی۔ ڈاکٹر شفیق انجم نے جس طرح حاشیے پر پڑے افراد کی سماجی، نفسیاتی یا شناختی صورتحال کو پیش کیا ہے وہ فن اور تکنیک کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔ موضوعاتی سطح پر دیکھیں تو حاشیے پر پڑے ان افراد کو اس صورتحال سے کس نے دوچار کیا اور اس سے ان کے سماجی، نفسیاتی یا شناختی سطح پر کیا اثرات مرتب ہوئے، مختلف کرداروں کے ذریعے ان سوالات کے جوابات تلاش کیے گئے۔

شفیق انجم کے افسانوں میں وجودی تناظرات کو اہمیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے جن پسے ہوئے افراد کو موضوعِ افسانہ بنایا وہ معاشرے سے بالکل کٹ کر رہ گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اپنی ذات سے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنی ذات کے اثبات کے متلاشی ٹھہرے۔ یہ ایک فطری بات ہے جب انسان کو خارج سے پناہ نہ ملے تو وہ داخل سے پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اور داخل میں انسان کی ذات ہی وہ پناہ گاہ ہے جس میں گم ہو کر وہ خارجی مسائل سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔ وجودیوں کا یہی طرزِ زندگی

ہے۔ ان افسانوں میں بھی یہ واضح کیا گیا ہے کہ جب انسانی سماج میں بگاڑ پیدا ہوا ہر طرف دھوکے بازی، جھوٹ، چوری، ڈاکازنی اور لوٹ مار اور قتل غارت یا دہشت گردی جیسے عناصر کا پھیلاؤ عام ہوا تو عام انسان کے لیے معاشرے میں رہنا دوبھر ہو گیا۔ جیسا کہ دو عالمی جنگوں کے بعد ایک ایسی صورتحال نے جنم لیا کہ انسان کا دوسرے انسان پر اعتبار ہی نہ رہا۔ ہر انسان دوسرے انسان سے خوف اور ڈر میں مبتلا ہونے لگا۔ دراصل انسان مرکز تصورات نے جن انسانی مفاد کی بات کی تھی انہوں انہوں ٹیکنالوجی اور علم کی ترقی کے نام پر دنیا کو خانہ جنگی میں دھکیل دیا جس سے انسانی تصورات کے حامل تمام فلسفوں سے چھٹکارے اور مایوسی کا رویہ پنپنے لگا۔ ان جنگوں نے انسان کی معاشی، سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کے بخیے ادھیڑ دیے۔ انہیں ایسے مسائل سے دوچار کر دیا کہ انسان کو اپنا تشخص بچانا ہی مشکل ہو گیا۔ زندگی کی جنگ ہر فرد کو اکیلے لڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ جس سے ان جنگوں سے پیدا ہونے والے ہیبت ناک اثرات اس قدر گہرے ہوتے چلے گئے کہ انسانی نفسیات بدل کر رہ گئی۔ ہر شخص ذہنی طور پر ہیجانی میں مبتلا ہو گیا۔ خوف، دہشت، مایوسی، ناامیدی، تنہائی و بیگانگی جیسے احساسات نے جنم لیا۔

اس صورتحال کے بعد انسان کے پاس کھونے کو کوئی چیز نہ بچی۔ ہر چیز ہر خواب، ہر امید، روشن مستقبل اور سکون کے لمحات وغیرہ سب کچھ جاتا رہا۔ سوائے اس وجود کے جو اس کے پاس مایوسیوں کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ ایسی صورت میں جب انسان بالکل اکیلا رہ گیا تو اُس نے اپنے وجود پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اپنے وجود سے اپنے ہونے کا اثبات کرنا شروع کر دیا۔ جس ایک نئے انسان نے جنم لیا اور اپنے وجود کو اہمیت دینا شروع کی۔ اور اپنی داخلی قوتوں سے زندگی جینے کا آغاز کیا۔ اور اس ہیجان کو جو اس کے اندر اور باہر دونوں جانب برپا تھا، اسے اپنی شناخت کے حصول کے ذریعے رفو کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس کے باوجود انسان نفسیاتی طور پر اس قدر زخمی ہو چکا تھا کہ وہ مایوسی، ناامیدی، جبر، دہشت، وحشت، خوف اور تنہائی سے باہر ہی نہیں نکل سکا۔ اس صورتحال میں جب وہ اپنی داخلی کیفیات، جذبات و احساسات کو فروغ دینے لگا تو خارج سے بالکل لاتعلق بھی ہو گیا۔ ایک طرف جہاں اس نے اپنے اثبات کے لیے داخل سے رجوع کیا تھا وہیں کارج سے منقطع بھی ہو گیا۔ جس کا نقصان یہ ہوا کہ انسان کارجی سطح پر بالکل تنہائی کا شکار ہو گیا۔ وہ اپنی داخلی کیفیات میں اس قدر محو اور مگن تھا کہ اسے کسی اور بات کی ہوش ہی نہ تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ انسان کو اس سماج پر اب بھروسا ہی نہ رہا تھا جس نے اس کی بھلائی اور فائدے کے بلند و بانگ دعوے

کیے تھے۔ تو نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ انسان کو اپنی ذات میں جھانک کر اپنا اثبات کرنا پڑا۔ لیکن اس اثبات کے باوجود مایوسی، ناامیدی اور تنہائی انسان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ جنہیں شفیق انجم نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ جدید افسانے کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے معاصر زندگی کے مسائل اور رجحانات کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر رشید امجد اور پروفیسر جاوید جیسی ادبی شخصیات نے انہیں عصری زندگی کے مسائل اور آلام کے نقوش واضح کرنے والا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہیں معاصر زندگی کا مصور گردانا ہے۔

زیرِ نظر تحقیق میں شفیق انجم کے افسانوں میں جبر اور تنہائی کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جس میں جبر اور تنہائی کے مختلف تناظرات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان افسانوں کو موضوعاتی سطح پر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شفیق انجم کے ہاں جبر کی جو صورتحال دکھائی گئی ہے اس کا ایک وسیع پس منظر ہے جس کا اظہار ابتدائی سطور میں کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں جبر کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ جو انسانی زندگی اور معاصر سماج میں ارد گرد ہر طرف نظر آتی ہیں۔ جس نے انسانی زندگی کو ایک قید خانہ بنا دیا ہے۔ ان کے افسانوں کی تفہیم سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کی آزادی کے قائل ہیں۔ آزادی اور اختیار کے مابین ایک کشمکش کی صورتحال ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ جہاں آزادی نہیں ہوتی وہاں اس کی جگہ غلامی یا قید یا جبر لے لیتا ہے۔ انسان نے جب سے ہوش سنبھالا اسے کسی نہ کسی پابندی یا اصول وضوابط کا سامنا رہا ہے۔ زندگی ایسے گزارو ایسے نہ گزارو یہ کرو وہ نہ کرو، زندگی کی بنیادی سے بنیادی بات بھی پابندیوں اور حدود کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ بعض اوقات انسان ان جکڑ بندیوں سے آزادی کا متلاشی بن جاتا ہے۔ اس وقت ہر اصول ہر ضابطہ قاعدہ جبر اور بوجھ بن جاتا ہے۔ جب جبر اپنی حد تجاوز کرنے لگتا ہے اور مجبور شخص کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا ہے تو پھر باغی رویے جنم لیتے ہیں۔

مجبور شخص جب بغاوت پر اترتا ہے تو سماج ایک خانہ جنگی اور فتنہ فساد کا گھر لگنے لگتا ہے۔ حساس طبیعت انسان اس سماج سے دور بھاگتا ہے۔ مؤقر افسانہ نگار نے اس احساس کو اپنے افسانوں کو حصہ بنایا ہے۔ اور جبر کی مختلف صورتوں کو مختلف کرداروں کے ذریعے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ بچپن سے لے کر مرتے دم تک انسان کو کسی نہ کسی جبر کا سامنا رہا ہے۔ کبھی سماج کا جبر تو کبھی معاشی جبر، کبھی سیاسی جبر تو کبھی اقتصادی جبر، کبھی تہذیبی جبر تو کبھی ثقافتی جبر، حتی کہ تقدیری جبر بھی انسان کی زندگی میں ہمہ وقت راستے کی

دیوار بنا رہتا ہے۔ مشرقی ماحول میں جہاں انسان مذہب کو اپنا راستہ اور اپنی منزل حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے وہیں اس کے اصولوں اور قواعد کا پابند بھی ہوتا ہے۔ پابندی ایک لحاظ سے مجبوری پیدا کرتی ہے۔ جو جبر کی ایک شکل ہے۔ شفیق انجم کے افسانوں میں تقدیری جبر کی وضاحت بھی ملتی ہے۔ جزا اور سزا، نیکی اور بدی، غلط اور صحیح کی صورتحال کو تقدیری تناظر میں مختلف واقعات اور کرداروں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اُن کا اولین افسانوی مجموعہ "میں + میں" میں تقدیری جبر کی مختلف صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی افسانے "میں + میں" میں جب انسانی شناخت کا بحران کو نمایاں کی اجاتا ہے تو اس بحران کے نتیجے میں عدم شناخت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے افسانے کا مرکزی کردار "میں" اپنی ذات میں پناہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ لیکن بعض اوقات انسان کی اپنی ذات سے بھی تشفی ممکن نہیں ہو پاتی اس صورت میں وہ خدا سے جسے وہ آقا و مالک جانتا اور مانتا ہے، اُس سے مدد مانگتا ہے۔ بعض اوقات انسان کی دعائیں اور انسان کا جس پر سب سے زیادہ توکل ہوتا ہے وہاں سے بھی دست گیری نہیں ہو پاتی تو پھر پایوسیوں اور ناامیدیوں کا ڈیرہ اس کی قسمت میں لکھ دیا جاتا ہے۔ یا یوں کہیں کہ وہ اپن تمام تر ہار کا ذمہ دار تقدیر کو ٹھہراتا ہے یا پھر اس تقدیر کو حتمی مانتے ہوئے صبر کرتا ہے۔ یہ صبر بھی ایک لحاظ سے جبر کی ہی ایک صورت ہے جسے تقدیری جبر کا نام دیا جائے تو بے جانہ ہو گا۔ ڈاکٹر شفیق انجم نے ان افسانوں میں اسی قسم کی صورتحال کی عکاسی کی ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور افسانہ "منجمد لمحوں کا سفر" بھی تقدیری جبر کو نمایاں کرتا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں بھی "میں" کا کردار اپنی تقدیر کے ہاتھوں مجبور نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں بھی اختیار اور جبر کے مابین ایک بوڑھے کردار کے ذریعے کشمکش دکھائی گئی ہے۔ جو خونریزی کو چاہتے ہوئے بھی روک نہیں پاتا اور پھر ہار کر اسے تقدیر کا لکھا گردانتا ہے۔ اسی طرح ایک اور افسانہ جس میں تقدیری جبر کو نمایاں کیا گیا ہے وہ مذکورہ کتاب کا تیسرا افسانہ "گمشدگی عنوان" ہے جس میں شناخت کے مسئلے کو تقدیر کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وجود کا مسئلہ انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ ہونا یا نہ ہونا یہ سب تقدیر کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ چاہے تو زندہ رکھے چاہے تو زندہ رہتے ہوئے بھی مردہ زندگی جینے پر مجبور کر دے۔ گویا انسان تقدیر کے ان دائروں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک اور افسانہ "دھند مسافت" میں بھی تقدیری جبر سے مملو کردار نظر آتا ہے جو بڑی سوچ بچار کے ساتھ اپنی زندگی کو بہتر کرنا چاہتا ہے۔ وہ کئی ارادوں، خوابوں، تدبیروں اور سوچ بچار کے باوجود بھی زندگی کو اچھے رُخ پر نہیں موڑ سکتا۔ تقدیر اس کے آگے آگے چل رہی ہے اور وہ کردار کو جیسے چاہے جس راست پر موڑ دے۔ اس تناظر میں کردار کو ایک گول ڈبے میں لڑھکتا ہوا

دکھایا گیا ہے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی بس لڑھکتی جا رہی ہے کسی کے بس میں نہیں کہ اسے روک سکے یا کسی اور رخ موڑ سکے۔ تقدیر کا یہ جبر اس افسانے میں بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح ان کی دیگر افسانوی مجموعوں میں بھی تقدیر کے اس کھیل کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی دوسری کتاب "لکھت لکھتی رہی" میں بھی تقدیری جبر کو مختلف واقعات اور کرداروں کے ذریعے کبھی جزوی تو کبھی مجموعی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ "لکھت لکھتی رہی"، "زنجیرِ زندگی"، "روشنی آواز دیتی ہے"، وغیرہ کئی افسانے اس ذیل میں گنوائے جاسکتے ہیں۔

شفیق انجم کے افسانوں میں جہاں تقدیری جبر کے نقوش ملتے ہیں وہیں ان کے موضوعات اور کرداروں کے مکالمات سے نفسیاتی جبر کی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔ تقدیری جبر کی جس صورتحال کو ابتدائی سطور میں پیش کیا گیا ہے اس سے لازمی طور پر نتیجے میں نفسیاتی ہیجان پیدا ہونا تھا۔ اس نفسیاتی ہیجان نے مجبور انسان کو زندگی اور موت کی کشمکش میں اضطراب اور بے سکونی کا شکار کر دیا۔ جس سے زندگی سے تنگ افراد موت کی جانب پیش قدمی کرنے پر مجبور ہونے لگے۔ یہ لازمی امر ہے کہ جس انسان کی شناخت مسخ کر دی گئی ہو، زندگی اس کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ جس سے یا تو چھٹکارا حاصل کر لیا جاتا ہے یا پھر مجبوری میں ساری زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ شفیق انجم کے افسانوں میں شناخت کا جو بحران نظر آتا ہے اس کے اثرات کرداروں کی نفسیات سے نمایاں ہوتے ہیں۔ جو اپنی ذات میں تقسیم ہوتے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے افسانے "میں + میں" اور "میں اور وہ" کے عنوانات سے ہی ظاہر ہے کہ ان افسانوں میں اپنی ہی ذات کے تضاد کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ایک ہی کردار دو زندگیوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک وہ جو اس کی اپنی شناخت تھی اور دوسری وہ جو عدم شناخت سے مملو ہے۔ ان دونوں رویوں اور زندگیوں کے مابین ایک ایسی نفسیاتی کشمکش کو دکھایا گیا ہے جس سے انسان کی داخلی اور خارجی کیفیات، احساسات و جذبات کی عکاسی ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے "دیمک کھنڈر آس" میں جہاں ایک مردے کے ذریعے انسانی بے حسی کو نمایاں کیا گیا ہے وہیں دیمک لگی زندگی اور اس کے نفسیاتی مضمرات کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ نفسیاتی جبر کی ایک اور مثال ان کے افسانے "تھک کر گرتے شوخ پرندے" سے بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ جس میں یہ واضح کی گیا ہے کہ انسان کی اپنی ایک الگ دنیا بھی ہوتی ہے جس میں وہ جینا چاہتا ہے۔ اس کے اپنے خوابوں کی دنیا۔ جس میں وہ کسی شہزادی یا حُور کا تصور رکھتا ہے۔ لیکن جب حقیقت اس کے سامنے آتی ہے تو اسے سب کچھ سراب معلوم

ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی اسے سراب معلوم ہوتی ہے۔ "جاڑوں میں کِھلا خواب" بھی نفسیاتی حوالے سے اہم افسانہ ہے۔ جس میں ایک کردار اپنی پہچان کے لیے کسی بابے کو تلاش کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ صوفیوں اور درویشوں کا طریق اپناتا ہے۔ اپنی ذات کی تلاش میں وہ اس قدر محو ہوتا ہے کہ پیچھے مڑنا اس کے لیے دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ "بِن لفظوں کے کہا سنا" میں بھی اسی نفسیاتی جبر کو پیش کیا گیا ہے جس میں لڑکے اور لڑکی کی محبت کو موجوع بنایا گیا ہے۔ جو اپنے بزرگوں کی دی گئی ہدایات کے مطابق محبت کو بھی اصول وضوابط کے تابع کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایسے احساسات ہیں جو کبھی قابو نہیں کیے جاسکتے۔ اس لیے لڑکا اور لڑکی اس نفسیاتی جبر کو توڑتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح کی نفسیاتی کشمکش اُن کے افسانے "اُکڑوں بیٹھا وقت" میں بھی نظر آتی ہے۔

شفیق انجم کا دوسرا افسانوی مجموعہ "لکھت لکھتی رہی" نفسیاتی اعتبار سے ایک اہم افسانوی مجموعہ ہے۔ جس کے تقریباً سارے افسانے نفسیاتی کرداروں کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ کہیں ان کے کردار نفسیاتی جبر کا شکار ہیں تو کہیں نفسیاتی طور پر تن تنہا زندگی بسر کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کتاب کا ایک اہم افسانہ "منظر خواب کا سا ہے" میں ایک ایسی نفسیاتی کشمکش دکھائی گئی ہے جو کردار پر جبر کی صورت میں ہر وقت طاری رہتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار اپنی شناخت کھو چکا ہے اور عدم شناخت اس پر بوجھ بنے اس کے لیے نفسیاتی ہیجان کا باعث بن رہی ہے۔ جس سے اس کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ زندگی اور موت کی اس کشمکش میں وہ ساری عمر اپنی شناخت پانے میں گزار دیتا ہے اور بالآخر اپنی شناخت کے لیے موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ افسانہ آخری تک قاری کو اپنے حصار میں لیے رکھتا ہے۔ یہ افسانہ نفسیاتی جبر کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اسی طرح کا ایک اور افسانہ "دنیا دکھ ہے" نفسیاتی اعتبار سے بہترین افسانہ ہے۔ جس میں فضل دین مزارع کا بیٹا مرکزی کردار ہے۔ جو ایک مزدور کی علامت ہے۔ جس کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک مزارع کا بیٹا اپنی اوقات کے مطابق کی ہی خواہش کر سکتا ہے۔ اگر اپنی اوقات سے باہر کوئی خواہش کرے گا تو اسے دبوچنے والے وڈیرے اس کے سر پر بندوق لے کر کھڑے ہیں۔ یوں نفسیاتی طور پر مزارع کا بیٹا کچھ بھی کہنے یا کرنے سے پہلے اپنی اوقات کی حدود کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ یا اسے اس کا پابند رکھا جاتا ہے۔ جو کہ ایک نفساتی جبر ہے۔ یہ افسانہ بھی ڈاکٹر شفیق انجم کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ جس میں فضل دین مزارع کا بیٹا اپنی کم حیثیتی کے نفسیاتی جبر کا شکار رہتا ہے۔

شفیق انجم کے افسانوں میں سماجی جبریت کی عکاسی بہت خوب انداز میں کی گئی ہے۔ سماجی حوالے سے ان کے افسانوں کے متنوع موضوعات ہیں لیکن انسانی داخلی اور خارجی صورتحال کے تناظر میں سماجی جبر ان کے ہاں ایک اہم موضوع رہا ہے۔ وہ اس مسئلے کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ مختلف کرداروں کے ذریعے اس مسئلے کو اجاگر بھی کرتے ہیں۔ جس نے سماج میں انسانی شناخت کو مسخ کر دیا ہے۔ ان کے تینوں افسانوی مجموعوں میں سماجی جبریت کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ اُن کا افسانہ "روشنی آواز دیتی ہے" اپنی نوعیت کا بہترین افسانہ ہے۔ جس میں زندگی کی جبری صورتحال کو پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح ان کا افسانہ "مٹی بوسہ دیتی ہے" میں بھی سماجی جبر کے ایک نئے پہلو کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ جس میں ایک شخص جو اپنے سماج سے تنگ آ کر کسی دوسرے سماج میں ہجرت کر جاتا ہے تو وہاں بھی اس کا جینا دو بھر ہو جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے جبر کی یہ صورتحال اس کا پیچھا کرتے کرتے وہاں پہنچ جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں پوری دنیا ایک ایسی عالمی صورتحال میں جکڑی جا چکی ہے جس میں بے سکونی، بے اطمینانی اور جبر و تنہائی کی بہت سی صورتیں وقوع پذیر ہوتی نظر آتی ہیں۔ جس انسان تنگ آ کر کسی نہ کسی کونے میں چھپنے یا بچنے کو کوشش میں مصروف ہے۔ اس تگ و دو میں وہ نہ صرف خود بوڑھا ہو جاتا ہے بلکہ اس کے اندر بیٹھا اس کا رہنما بھی نحیف و نزار کی حالت میں نظر آتا ہے۔

اسی طرح اُن کے دیگر افسانوں میں "لکھت لکھتی رہی"، "دنیا دکھ ہے"، "میں + میں"، "چلمنوں کے اُس پار"، "چپ چاپ چلے سودائی۔۔ ہُو"، "تھک کر گرتے شوخ پرندے" اور دیگر کئی افسانوں میں جبر کی سماجی صورتحال کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ سارے افسانے انسان کی آزادی کے ساتھ مربوط ہیں۔ افسانہ نگار کے ہاں ان طبقات اور ان افراد کو موضوعِ افسانہ بنایا گیا ہے جو پسے ہوئے، کچلے ہوئے یا جنہیں معاشرے میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی انہیں اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ قتل و غارت، جبر و تشدد سے انسانی فکر و سوچ میں جو انتشار پیدا ہوا اور اس سے سماج میں ہونے والا بگاڑ کس حد تک معاشرے کو متاثر کرتا ہے اسے بہت حد تک حقیقی انداز میں پیش کر دیا ہے۔ جس سے افسانے میں ان نکات پر براہِ راست توجہ مرکوز ہوتی ہے جو انسان دشمنی پر مبنی ہیں۔ یا اس کے بارے میں جکڑ بندیوں اور آزادی کی پامالیوں کو فروغ دے رہے ہیں۔ دہشت گردی اور سماج میں لوٹ مار نے ایک حساس انسان کو اس قدر سماجی و نفسیاتی طور پر جبر کا شکار کر دیا ہے کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق آزادی سے معاشرے میں سانس بھی نہیں لے سکتا۔ ڈاکٹر شفیق

انجم نے اپنے افسانوں میں اسی قسم، کی صورتحال کو تخلیقی انداز میں اس طرح پیش کر دیا ہے کہ ہر کردار ان کا قاری کے ذہن گھر کر جاتا ہے۔ اور اسے سے جڑے واقعات اور کہانیاں قاری کو یاد رہ جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر شفیق انجم کے ہاں چاہے سماجی جبر ہو یا نفسیاتی یا پھر تقدیری جبر ہر اافسانے میں بڑی عمدگی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ جسے کرداروں کی داخلی اور خارجی صورتحال میں تقسیم کر کے پیش کیا گیا ہے۔

شفیق انجم نے اپنے افسانوں میں صرف اس جبر کے خدوخال کو نمایاں نہیں کیا بلکہ اس جبر سے پیدا ہونے والے انسانی فاصلوں، تنہائیوں اور بیگانگیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اس جبر و تشدد کے ماحول میں انسان کو اپنے وجود کو بچانے اور اس کے اثبات کا مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے دو عالمی جنگوں کے بعد انسانی سماج کی صورتحال بنی رہی جس کے اثرات ابھی تک جاری ہیں۔ جب خارج سے کسی من چاہی شے کا اثبات نہ ہو سکے یا دکھ تکلیف کا مداوا نہ ہو سکے تو انسان فطری طور پر اپنی ذات میں گم ہو جاتا ہے اور خود کو تنہا کر لیتا ہے۔ بعض دفعہ یہ صورتحال نہ بھی ہو تو عالمگیر صورتحال جس نے انسان کو بالکل مشینی بنا دیا ہے اس سے بھی انسان تنہا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس صورتحال کو بھی شفیق انجم نے اپنے افسانوں میں بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

ان کا افسانہ "مٹی بوسہ دیتی ہے" اس حوالے سے عمدہ افسانہ ہے جس میں اس بات کو واضح کی گیا ہے جب خاندان کا عزیز یا رشتہ دار جب ملک سے باہر یا اپنے چاہنے والوں سے دور چلا جاتا ہے تو خاندان والے کس کرب سے گزرتے ہیں اور اس سے وہ خود کو بالکل اکیلا اور تنہا سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کی دوسرے شخص سے وابستگی ہو جاتی ہے تو پھر اس وابستگی سے نجات پانا بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری مسئلہ ہے جسے شفیق انجم نے اپنے اسن افسانوں میں جگہ جگہ پیش کیا ہے۔ "روشنی آواز دیتی ہے" میں بھی اسی مسئلے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح "منظر خواب کا سا ہے" میں بھی تنہائی کے سماجی تناظرات کو پیش کیا گیا ہے۔ جہاں فرد عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے اس معاشرے میں زندگی کا وجود ناپید اور معدوم ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ جس سے انسان نفسیاتی طور پر ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو تنہا کر لیتا ہے اور اپنے ہونے اور نہ ہونے کے مسئلے کو سوچتا رہتا ہے۔ اپنے وجود کے اثبات میں گوشۂ تنہائی میں چلا جاتا ہے۔ جیسے وجودیوں کا طرزِ عمل رہا ہے۔ اس ذیل میں ان کے دیگر افسانوں میں "تھک کر گرتے شوخ پرندے"، "دنیا دکھ ہے"، "بن لفظوں کے کہا سنا"، "چلمنوں کے اُس پار"، "ایک عام سا واقعہ" قابلِ ذکر

ہیں۔ جس میں تنہائی کے سماجی مضمرات اور تناظرات کو بڑی عمدگی سے نمایاں کیا گیا ہے۔ جس سے معاصر سماج کی بھی عکاسی ہوتی نظر آتی ہے۔ آج کا انسان جس معاشرتی بگاڑ اور انتشار کا شکار ہو چکا ہے اس میں ایک حساس انسان کا زندگی جینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودکشیوں کی شرح میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ ان مسائل سے پردہ اٹھانا ہی ایک اچھے افسانہ نگار کا کام ہے۔ جسے ڈاکٹر شفیق انجم نے بخوبی نبھایا ہے۔

جس طرح سماجی سطح پر انسان تنہائی اور بیگانگی کا شکار ہو گیا ہے بالکل اسی طرح نفسیاتی ہیجان کا بھی شکار ہوا ہے۔ اور اس ہیجان نے نفسیاتی طور پر بھی اسے معاشرے میں اکیلا کر دیا ہے۔ مشینی دور نے جہاں انسان کی اہمیت کم کر دی ہے وہیں اسے ایک پراڈکٹ بھی بنا دیا ہے۔ جسے بیچا اور خریدا جا سکتا ہے۔ اس ساری صورتحال نے انسان کو نفسیاتی طور پر اس قدر متاثر کیا ہے کہ وہ اپنے وجود کے اثبات کے لیے تگ و دو کرنے لگا۔ کاص طور پر جدیدیت کے نام جو جنگیں لڑی گئیں ان سے جو معاشرتی بگاڑ اور انسانی خون کی ہولی کھیلی گئی اس سے سماج کا ہر چھوٹ بڑا فرد متاثر ہوا۔ جس نے انسان کو بالکل نفسیاتی طور پر تقریباً ختم کر دیا تھا۔ بقیہ جو لوگ سوچنے کے قابل رہے تھے انہوں نے اپنی ذات کے اثبات کے لیے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ جس نے انہیں مزید مایوسیوں اور ناامیدیوں میں دھکیل دیا۔

شفیق انجم نے اس صورتحال کو تقریباً اپنے تمام افسانوں میں جزوی یا مجموعی طور پر پیش کیا ہے۔ البتہ جن افسانوں میں خصوصی طور پر نفسیاتی تنہائی کا ادراک ہوتا ہے ان میں "دیمک زدہ کھنڈر آس"، "میں کون ہوں"، "اپنے لیے ایک نوحہ"، "کہو۔۔ کہو میری جان"، اور دیگر کئی افسانوں میں نفسیاتی تنہائی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مشینی دور سے لے کر مابعد جدید دور تک انسان جس کرب سے گزرا ہے یا اسے گزارا گیا ہے اور گزارا جا رہا ہے، اس صورتحال سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش کو سماجی سطح سے اٹھا کر انسانی سطح پر پیش کرنا ایک اہم معاملہ ہے۔ جسے شفیق انجم نے بہت حد تک پیش کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے ان افسانوں میں انسان کی نفسیات کا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے جس کے مطابق انسان اپنی شناخت پر کبھی سمجھوتا نہیں کرتا۔ اور جہاں کہیں بھی اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شناخت کو مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تو وہ اپنے تئیں مزاحمت کرتا ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے ہتھکنڈے اس حد تک عالمگیر نوعیت اختیار کر چکے ہیں کہ انسان کی اپنی شناخت اب کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسے عدم شناخت سے دوچار کر کے اپنے مطلب کے مقاصد حاصل

کیے جاتے ہیں۔ اب میڈیا اور ٹیکنالوجی کے ذریعے انسان برائے فروخت ہے۔ اور ایک حساس انسان جب عالمی منڈی میں اپنی خرید و فروخت کا سودا ہوتے دیکھتا ہے تو وہ لاچاری اور مجبوری کے عالم میں خود کو الگ تھلگ کر لیتا ہے۔ اپنی ذات میں اپنی شناخت ڈھونڈنے لگتا ہے۔ وہ اس دور میں تگ و دو کرتا ہے لیکن اسے پھر بھی شناخت حاصل نہیں سکتی۔ جیسا کہ شفیق انجم نے اپنے اکثر افسانوں میں اپنے کرداروں کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان چاہے جتنی مرضی کوشش کر لے وہ اپنی خواہش کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ جہاں جبر و تشدد اس کے چاروں طرف رقص کر رہا ہو تو ایسی صورتحال میں وہ اپنے حق کے لیے آواز بھی نہیں اٹھا سکتا۔

اس کے علاوہ ان کے افسانوں کا جو اہم موضوع رہا ہے وہ ہے شناختی تنہائی۔ شناختی تنہائی کے جو تناظرات یا مضمرات ہیں انہیں ڈاکٹر شفیق انجم نے اپنے افسانوں میں بخوبی انداز میں پیش کیا ہے۔ جیسا کہ ابتدائی سطور میں واضح کیا گیا کہ خارجی ماحول سے متاثرہ انسان جب داخل میں گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے تو وہ سماج سے بالکل کٹ جاتا ہے۔ جس سے اس کی اپنی شناخت بھی متاثر ہوتی ہے۔ اور اگر اس کے پس منظر میں دیکھیں جس نے اس انسان سماج سے کٹنے پر مجبور کیا تو وہ صورتحال بھی ایک انسان دشمن سماج کو فروغ دیتی ہے۔ اسی انسان دشمن سماج نے انسان کی شناخت کو مسخ کر دیا ہے جس سے وہ اپنی ذات کے اثبات کے لیے گوشہ نشینی و تنہائی کو فوقیت دیتا ہے۔ اس ذیل میں شفیق انجم کے جن افسانوں کو گنوایا جا سکتا ہے اُن میں "گمشدگی عنوان"، "میں کون ہوں"، "دیمک زدہ کھنڈر آس"، "میں مصور و نقش گر"، "ادھوری کہانی"، "روشنی آواز دیتی ہے"، "شور میں گم ماتم"، اور دیگر کئی افسانوں میں شناخت کے مسئلے کو اجاگر کی گیا ہے۔

حاصلِ بحث یہ ہے کہ شفیق انجم کے افسانوں میں جبر اور تنہائی کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ جن سے سماج کے بگاڑ اور اس سے پیدا ہونے والے نفسیاتی ہیجان کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور انسان کی شناخت اور عدم شناخت کے مابین سماجی و نفسیاتی سطح پر جو کشمکش پیدا ہوتی ہے اسے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر شفیق انجم کے افسانے معاصر زندگی کے عکاس ہیں۔

ب۔ تحقیقی نتائج

میری اس تحقیق کے نتائج درج ذیل ہیں۔

۱۔ شفیق انجم کے افسانوں میں جبر کی مختلف صورتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ تقدیری، سماجی اور نفسیاتی سطحوں پر یہ صورتیں کبھی کہانی، کبھی کرداروں اور کبھی صورتحال کے روپ میں سامنے لائی گئی ہیں۔ اس ذیل میں شفیق انجم کے جن افسانوں کو بالخصوص پیش کیا جا سکتا ہے اُن میں "میں + میں"، "لکھت لکھتی رہی"، "گمشدگی عنوان"، "دھند مسافت"، "چلمنوں کے اُس پار"، "میں کون ہوں؟"، "روشنی آواز دیتی ہے"، "گھنی سیاہ رات"، "منظر خواب کا سا ہے"، "دُکھتی روگ کہانی"، "میں مصور و نقش گر"، "دنیا دکھ ہے"، "ادھوری کہانی" وغیرہ اہم ہیں۔

۲۔ تنہائی کے سماجی، نفسیاتی اور شناختی تناظرات اور اثرات بھی ڈاکٹر شفیق انجم کے ہاں ایک اہم موضوع ہے۔ ان کے افسانوں کے کئی کردار تنہائی کا شکار ہیں۔

۳۔ شفیق انجم کے تینوں افسانوی مجموعوں میں جبر اور تنہائی کی جو صورتحال نظر آتی ہے وہ جدید دور کے بعد پیدا ہونے والی ابتری کی صورتحال ہے۔ جسے مختلف کرداروں اور کہانیوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ جن کے کرداروں کا سب سے بنیادی مسئلہ شناخت کا ہے۔ شناخت کا یہ مسئلہ سماج میں جبر و تشدد اور اس سے پیدا ہونے والی تنہائی و بیگانگی سے پیدا ہوا ہے۔ اُن کے افسانوں میں اکثر کردار عدم شناخت کے حامل ہیں۔

ج۔ سفارشات

۱۔ شفیق انجم کے ناول "وجود" پر جبر اور تنہائی یا وجودیت کے تناظر میں کام کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ شفیق انجم کے افسانوں میں شناخت کا بحران بہت اہم موضوع ہے اس حوالے سے انفرادی کام بھی کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ شفیق انجم کے افسانے جدید افسانے ہیں۔ جدیدیت کے تناظر میں ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

i. بنیادی مآخذ

۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، اسلوب، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۱ء

۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، روشنی آواز دیتی ہے، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء

ii. ثانوی مآخذ

۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ۲۰۱۸ء

۲۔ اشفاق احمد، محمد اکرام چغتائی (مرتبین)، فرہنگ اصطلاحات۔ جلد اول، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء

۳۔ بختیار حسین، وجودیت کیا ہے، راوی، لاہور، ۱۹۶۸ء

۴۔ بختیار حسین صدیقی، وجودیت، مرتبہ جاوید اقبال ندیم، پنجاب بک سنٹر، لاہور، ۱۹۸۹ء

۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۷ء،

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

۷۔ جامع اللغات، ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب لاہور، س ن

۸۔ جاوید حسین، قاضی، وجودیت، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۷۳ء

۹۔ جمیل اختر مجبی، ڈاکٹر، فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی، ۲۰۰۲

۱۰۔ جلیل الرحمان، تہذیبی اساس، جوہر پریس، جوہر آباد، ۱۹۹۵ء،

۱۱۔ حیات عامر حسینی، ڈاکٹر، وجودیت، روشن پبلی کیشنز، سری نگر، ۱۹۹۰ء

۱۲۔ حمید شاہد، محمد، "اردو افسانہ: صورت معنی"، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

۱۳۔ سید احمد دہلوی، مولوی، (مؤلف) فرہنگِ آصفیہ، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ لاہور، ۱۹۴۷ء

۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، خود شناسی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

۱۵۔ سی اے قادر، وجودیت، مشمولہ: ادب فلسفہ اور وجودیت، مرتبہ: شیما مجید، نعیم احسن، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۲ء

۱۶۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (جلد دوم)، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، لاہور، طبع دوم ۱۹۷۴ء،

۱۷۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ – بیسوی صدی کی تحریکوں اور رجحانات کی روشنی میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۲۱ء

۱۸۔ صبا اکرام، جدید افسانہ – چند صورتیں، فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۲۰۰۱ء،

۱۹۔ صدف سلطان، گلوبلائزیشن: مسلم دنیا پر ثقافتی اثرات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، (غیر مطبوعہ)، یونی ورسٹی آف دی پنجاب لاہور، ۲۰۱۰ء،

۲۰۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، راگ رت، خواہش مرگ اور تنہا پھول، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء

۲۱۔ طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ – سیاسی و تاریخی تناظر میں، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۵ء

۲۲۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع دوم ۲۰۱۰ء

۲۳۔ محمد خاں، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اشاریت (1960ء کے بعد)، ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد، ۲۰۰۵ء،

۲۴۔ محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم ۲۰۰۷ء

۲۵۔ نیاز عرفان، علامہ اقبال اور وجودی فلسفہ (مقالہ)، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۵۹ء

انگریزی کتب

28. Bashir Ahmed Qureshi (ed.), Practical Dictiionary (English into Urdu), The Kitabistan Publishing Company Lahore

29. Copleston, F.C., Existentialism and Modern Man, Black Fairer, London,1948

30. Cuddon, J.A, Dictionary of Literary Terms and Literary Theory, Penguin Books Great Britain, 1992

31. Fallon, S.W. (ed.), English Urdu Dictionary, Urdu Science Board Lahore, 1982

32. Godfrey vesey, Paul Foulkes, Collins Dictionary of Philosophy, Book press, London, 1990

33. George Novack, Existentialism versus Marxism, A Delta Book, N. Y, 1978

34. H.J. Blackham, Six Existentialist thinkers Routledge, London, 1961

35. Jeaan Paul Sartre, Being and nothingness, Tr. By Hazel, E. Barnes, University of Colorado, Washington press, N. Y. 1966

37. Macquarrie, John, Existentialism, Penguin Books Great Britain, 1980

38.Richard Gill & Emest Sherman (ed.), The Fabric of Existentialism Philosophical and Literary sources, Meredith Corporation, New York, 1973

39.Popular Oriental Practical Dictionary ,Oriental Book Society, Lahore,2002

رسائل / جرائد

۱۔ الماس، جامعہ عبد الطیف بھٹائی، خیر پور، شمارہ:۲۰، ۲۰۱۸ء

۲۔ ادبی دنیا، شمارہ نمبر ۱۲، کراچی، ۱۹۶۴ء

۳۔ تحقیقی جریدہ، (جنوری-جون)، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ، شمارہ:۷، ۲۰۲۰ء

۴۔ راوی، شمارہ نمبر ۱۰، لاہور، ۱۹۶۸ء

۵۔ ادبیات، شمارہ نمبر ۱۲، ۲۰۱۹ء

ضمیمہ

الف۔ انٹرویو

مقالہ نگار: آپ ایک اچھے افسانے کی کیا تعریف کریں گے؟

شفیق انجم: اچھے افسانے کی تعریف آسان نہیں لیکن میرے خیال میں ہر وہ افسانہ اچھا ہے جو کہانی، تاثر یا خیال کی ترسیل اس طور کرے کہ پڑھنے والا اس سے لطف اندوز ہو۔ یہ لطف اندوزی حسی، نفسی، روحانی، جنسی یا مابعد الطبیعاتی بھی ہو سکتی ہے اور لسانی، اسلوبی و ثقافتی تاریخی وغیرہ بھی۔ اچھا افسانہ کسی بھی صورت میں بے لطف نہیں ہونا چاہیے۔

مقالہ نگار: آپ کے افسانوں میں فرد کی شناخت اور عدم شناخت کا مسئلہ بہت اہم نظر آتا ہے۔ اِس کا کوئی خاص سبب؟

شفیق انجم: اس کا سبب کچھ ٹھیک سے معلوم نہیں لیکن تیقن میں دراڑیں پڑتی ہیں تو شناخت کا بحران جنم لیتا ہے۔ بظاہر یہ زمانہء حال اور جدید زندگی کا تحفہ لگتا ہے لیکن میں کون، میں کہاں، میں کیوں کے سوالات بہت پرانے ہیں۔ یہ معاملہ ہر سوچنے والے کے ساتھ رہا ہے۔ ہاں جدید دور میں یہ کچھ زیادہ گھمبیر ہو گیا ہے اور اس کی وجہ کائنات اور حیات کے بارے میں انسان کی روز افزوں آگہی ہے۔ کچھ بھی مستقل بذات نہیں، ہونا نہ ہونا اضافی ہے۔ تو پھر شناخت کا سوال تو اٹھتا ہے۔ میں نے شدت سے اس معاملے پر سوچا ہے اور اپنے افسانوں میں اسے لکھنے کی کوشش کی ہے۔

مقالہ نگار: آپ کے بیشتر افسانوں میں اپنی ذات سے خود کلامی کی گئی ہے اور اپنے ہونے کے معانی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ "میں + میں"، "منجمد لمحوں کا سفر"، "گم شدگی

عنوان" اور دیگر کئی افسانے اِس ذیل میں گنوائے جاسکتے ہیں۔ آپ کے ہاں اپنی ذات کا یہ مسئلہ اتنا اہم کیوں ہے؟

شفیق انجم: جی اس کی اساس فلسفیانہ ہے۔ 'میں ہوں' کے معاملے پر آپ جتنا سوچتے ہیں گہرائی بڑھتی جاتی ہے۔ بعض اوقات سفر 'میں نہیں ہوں' کی طرف چلا جاتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ نہ ہو کر بھی میں ہوں۔ کتنا کتنا، کہاں کہاں، کیسے کیسے، غور کرتے جائیں، اسرار کھلتے جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ معاملہ بنیادی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذات کی کھوج میرے لیے زندگی کی کھوج کے مترادف ہے۔ اگر میں یہ نہ سوچوں تو مر جاوں لیکن خوش قسمتی سے، میں مرنے سے پہلے سوچنا چاہتا ہوں۔

مقالہ نگار: ڈاکٹر رشید امجد نے آپ کی کتاب "میں + میں" کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "(آپ کو) مادیت و روحانیت کے سنگم پر ایک ایسے انسان کی شناخت کا سفر درپیش ہے جو جدید عہد کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنے روحانی ورثہ سے بھی متصوف ہے۔" اس بیان سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟

شفیق انجم: ڈاکٹر رشید امجد نے درست لکھا ہے۔ میں مادیت اور روحانیت کے سنگم پر کہیں ہوں۔ میں یہاں رہنا چاہتا ہوں کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں رہ کر میں سوچ سکتا ہوں، زندہ رہ سکتا ہوں۔

مقالہ نگار: احمد جاوید نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "آپ کے اسلوب میں کچھ شاعرانہ پن نمایاں ہے"۔ جبکہ شمس الرحمان فاروقی اُن کے اِس مؤقف سے متفق نہیں ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی کے بقول "آپ کے افسانے خاصے سوچے سمجھے بیانیے ہیں"۔ آپ ان دونوں متضاد آراء کے بارے میں کیا کہیں گے؟

شفیق انجم: جی دونوں صاحبان کی رائے درست ہے۔ احمد جاوید نے میرے فکری تموج میں شاعرانہ پن کو بھانپ لیا اور شمس الرحمان فاروقی نے فنکارانہ محنت کو۔ میں شاعری بھی سوچ سمجھ کر کرتا ہوں۔ یہی میرا ہنر ہے۔

مقالہ نگار: آپ کے افسانوں سے نمایاں سماجی و نفسیاتی جبر کے مطابق، انسان معاشرے میں تنہائی و بیگانگی کا شکار ہو گیا ہے۔ آپ کے نزدیک اس صورتحال کا سبب کیا ہے؟ اور یہ بھی بتائیں کہ اس صورتحال کی عکاسی میں نئے افسانہ نگار کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟

شفیق انجم: سماجی جبر میرے لیے ہمیشہ بہت تکلیف دہ رہا ہے۔ یہ آزادی سے آپ کو جینے نہیں دیتا۔ آپ عمر بھر دوسروں کی منشا کے مطابق جیتے ہیں۔۔۔ کتنا تکلیف دہ معاملہ ہے۔ لیکن ہم کڑھ سکتے ہیں، کچھ کر نہیں سکتے۔ یہیں سے نفسیاتی خلجان کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہر فرد کسی نہ کسی سطح پر اس نفسیاتی خلجان کا شکار ہے۔ میں نے لوگوں کو بہت قریب سے ٹٹولنے کی کوشش کی ہے، اندر سے مریض ہی برآمد ہوا ہے۔ کسی نہ کسی جبر کا شکار مریض۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس جینے کے خوبصورت حوالے بہت کم ہیں۔ ہم کبھی زندگی کا لطف نہیں لیتے۔ زندگی کا کوئی خوش کن تصور ہمیں چھو کر بھی نہیں گزرتا۔۔۔ یہ سماجی، سیاسی، نفسی جنسی جبر کے کرشمے ہیں۔ ہم تو اکیلے میں بھی اکیلے نہیں ہو پاتے۔ پس یہ میں نے اپنے افسانوں میں لکھا ہے۔

مقالہ نگار: ڈاکٹر رشید امجد سے آپ کی قلبی و علمی وابستگی رہی ہے۔ میری ذاتی رائے میں آپ کے افسانوں میں ڈاکٹر رشید امجد کا اسلوبیاتی عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

شفیق انجم: شروع میں ایسا ہی تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میں نے اپنا رستہ نکال لیا۔ فن کے ارتقائی سفر میں ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنے کسی پیشرو سے متاثر ہوتے ہیں لیکن بعد میں اپنے ڈھنگ پر

لکھنے لگتے ہیں۔ میں بھی اپنا ڈھنگ نکالنے میں کامیاب ہوا اور صد شکر کہ اب میرا اسلوب آپ الگ سے پہچان سکتے ہیں۔

مقالہ نگار: آپ کی کتاب "روشنی آواز دیتی ہے" کے دیباچے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے آپ کو تخلیقی تناظر میں، خطرناک شخص، خفیہ جاسوس، ایجنسی کا کارندہ، بگلا بھگت، گُپت فقیر، بنجارا، بے حد چالاک کہا ہے اور آپ کے افسانوں کو خفیہ رپورٹیں اور ایک سازش کہا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

شفیق انجم: ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ نے بالکل بجا لکھا ہے۔ ان افسانوں کا مزاج ہی ایسا ہے کہ یہ سارے لفظ درست بیٹھتے ہیں۔ باقی آپ پڑھ کر فیصلہ کر لیجیے۔

مقالہ نگار: کتاب "روشنی آواز دیتی ہے" میں روشنی بطور علامت استعمال ہوئی ہے۔ روشنی کسے آواز دے رہی ہے اور اس کا پس منظر کیا ہے؟

شفیق انجم: میرے نزدیک حیات و کائنات کا اصول الاصول روشنی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے اللہ نور السموات والارض۔ اور اسی طرح کی دیگر بہت سی آیات۔ ہم سب کو یہ روشنی فیسی نیٹ کرتی ہے۔ اپنی طرف بلاتی ہے۔ اور بالآخر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ستارے کہکشاؤں میں کھو جاتے ہیں۔ ہمارا جینا مرنا روشنی سے نکلنا، روشنی میں مدغم ہونا ہے۔ اس کا متضاد اندھیرا ہے۔ خدا ہمیں اندھیروں سے بچاتا روشنی کی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ روشنی ہمیں آواز دیتی رہتی ہے۔

مقالہ نگار: آپ ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ آپ نئے افسانہ نگاروں کو کیا مشورہ دینا چاہیں گے؟

شفیق انجم: میں طفل مکتب ہوں۔ منجھا ہوا ہونا تو بڑی دور کی بات ہے۔ کسی کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں لیکن میرے نزدیک سب سے اہم بات غور و فکر ہے اور پھر ہڈی توڑ محنت۔ اپنے حصہ کے کام کیجیے، صلہ اور کامیابی خدا پر چھوڑ دیے۔